جلد 3 / شمارہ 4

تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

اپریل ۲۰۲۳ء

ماہ نامہ

مفاہیم

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

- ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟
- جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے
- معرکہ عینِ جالوت اور احیائے خلافت

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
اقبال

مَن يُرِدِ اللّٰهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ

ماہ نامہ
مَفَاهِيم
کراچی

فقہ اکیڈمی کا ترجمان | تفقہ فی الدین کا داعی ادارہ

سرپرستِ اعلی

حضرت مولانا مفتی نذیر احمد ہاشمی صاحب مد ظلہ

مدیر

صوفی جمیل الرحمن عباسی

نائب مدیر

مولانا حماد احمد ترک

مجلسِ مشاورت

- ڈاکٹر محمد رشید ارشد
- مفتی اویس پاشا قرنی
- مولانا معراج محمد
- مولانا سید اسامہ علی
- مولانا ابرار حسین
- مولانا عابد علی بھٹی

فقہ اکیڈمی

C-335، بلاک-1، گلستان جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی، پاکستان۔ 3474 3662 21 92 + | 3474 3661 21 92 +

FIQHACADEMY.COM.PK FIQHACADEMY FIQHACADEMYPK +92 330 3474223

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مضامین

نعت	خدا کا ذکر کرے	ادیبؔ رائے پوری	۴
اداریہ	رمضان میں صدقہ وخیرات کی کثرت	مدیر	۵
درسِ قرآن	عبادالرحمٰن کا وصف: قرآنی آیات سے اثرپذیری	مولانا محمد اقبال	۸
درسِ حدیث	ہماری بدحالی کی وجوہات	ابنِ عباس	۱۳
تنقیدِ مغرب	ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟(۲)	ڈاکٹر محمد رشید ارشد	۱۷
مقالات	جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے (۵)	مولانا حماد احمد ترکؔ	۲۵
مقالات	معرکہ عینِ جالوت اور احیاے خلافت	صوفی جمیل الرحمٰن عباسی	۳۲
فقہیات	القواعد الفقهية: القاعدة التاسعة	مفتی نذیر احمد ہاشمی	۴۸
یسئلونک	نمازوں اور روزوں کا فدیہ	دارالافتاء، فقہ اکیڈمی	۵۰
ادبیات	نظم: غرّہ شوال یا ہلالِ عید	شاعرِ مشرق علامہ اقبال	۵۱

ادیبؔ رائے پوری (۱۹۲۸ء۔۲۰۰۴ء)
معروف ادیب اور شاعر

خدا کا ذکر کرے

خدا کا ذکر کرے، ذکرِ مصطفیٰ نہ کرے
ہمارے منہ میں ہو ایسی زباں خدا نہ کرے

درِ رسول پہ ایسا کبھی نہیں دیکھا
کوئی سوال کرے اور وہ عطا نہ کرے

کہا خدا نے شفاعت کی بات محشر میں
مرا حبیب کرے، کوئی دوسرا نہ کرے

مدینے جا کے نکلنا نہ شہر سے باہر
خدا نخواستہ یہ زندگی وفا نہ کرے

اسیر جس کو بنا کر رکھیں مدینے میں
تمام عمر رہائی کی وہ دعا نہ کرے

شعورِ نعت بھی ہو اور زبان بھی ہو ادیبؔ
وہ آدمی نہیں جو ان کا حق ادا نہ کرے

*****

مدیر

ماہنامہ مفاہیم، کراچی

رمضان میں صدقہ و خیرات کی کثرت

اللہ تعالیٰ کے بے پایاں احسانات ہم پر جاری وساری ہیں جو اللہ کی جود وعطا کا مظہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ سخی رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے: «اللهُ تَعَالَى أَجْوَدُ جُودًا ثُمَّ أَنَا أَجْوَدُ بَنِي آدَمَ» (مشکاۃ المصابیح) ”اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سخی ہیں، پھر اس کے بعد میں تمام بنی آدم سے بڑھ کر سخی ہوں“۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، وہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بارے میں فرماتے ہیں: «كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ، وَكَانَ أَجْوَدُ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِينَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ، وَكَانَ يَلْقَاهُ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ، فَلَرَسُولُ اللهِ ﷺ أَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ» (متفق علیہ) ”رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں کو خیر پہنچانے میں سب لوگوں سے بڑھ کر سخی تھے اور ماہِ رمضان میں آپ زیادہ سخی ہو جایا کرتے تھے جب کہ حضرت جبریل علیہ السلام آپ سے ملاقات کرتے تھے۔ اور وہ ہر رات آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ملا کرتے تھے اور آپ کو قرآن کا دور کراتے تھے، پس پھر رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سخاوت اور فیض رسانی میں چلتی ہوا سے بھی زیادہ تیز ہو جایا کرتے تھے“۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ابتدائی سخاوت بھی سب لوگوں سے بڑھ کر تھی لیکن آپ کی اضافی سخاوت جو رمضان میں ظہور پذیر ہوتی تھی وہ جو چلتی ہوا سے بھی تیز تھی۔ رمضان کی سخاوتِ مزید کی وجہ کی جانب ایک اشارہ اس روایت میں پایا جاتا ہے کہ یہ اس دورۂ قرآنی کے سبب تھا جو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جبریل علیہ السلام کے ساتھ مل کر کیا کرتے تھے۔

اس وقت ہم رمضان المبارک میں ہیں۔ ہم یقیناً قرآنِ کریم کی سماعت اور اس کی درس و تدریس میں مشغول ہیں تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم میں "سخاوتِ نبوی" کا کوئی عشرِ عشیر پیدا ہوا کہ نہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: أُحِبُّ للرجلِ الزيادةَ بالجودِ في شهرِ رمضانَ اقتداءً برسول اللهﷺ، ولحاجةِ الناسِ فيه إلى مصالحِهم (لطائف المعارف) "میں لوگوں کے لیے پسند کرتا ہوں کہ وہ رمضان میں سخاوت کا مظاہرہ کریں، رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے سبب اور اس لیے بھی کہ رمضان میں لوگوں کو سامانِ ضرورت کی حاجت بھی ہوتی ہے"۔

رمضان کی سخاوت کا مشہور و معروف طریقہ تو افطار کی ضیافت ہے۔ احادیث میں افطار کرانے کی فضیلت نقل ہوئی البتہ آج کل اسے سماجی یا کاروباری تعلقات اور میل ملاپ کا ذریعہ بنالیا گیا ہے۔ اس صورت میں اجر و ثواب کا انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن جس چیز کی جانب توجہ مبذول کرانا مقصود ہے کہ اس طرح کی افطار پارٹیوں میں غریب و مسکین لوگوں کو بھی ضرور شامل کرنا چاہیے جو نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ روزہ رکھتے تو کسی مسکین کے بغیر افطار نہیں کرتے تھے اور بسا اوقات اپنا کھانا بھی مساکین کو دے دیتے۔ (لطائف المعارف) حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مسجد میں کھانا رکھوا دیتے اور فرماتے کہ یہ مسجد میں رک کر مشغولِ عبادت، مسافر اور حاجت مند کے لیے ہے"۔ (فصل الخطاب فی الزہد والرقاق والآداب، محمد نصر الدین محمد عویضہ) سلف کے بارے میں آتا ہے کہ وہ بلا بلا کر مساکین کو افطار میں شریک کیا کرتے تھے تو ہمیں افطار کی دعوتوں میں مساکین کی شرکت کا خیال رکھنا چاہیے"۔

افطار کی دعوتوں کا ایک جدید طریقہ " افطار پیکیج" ہے۔ یعنی افطار کا سامان پیک کر کے ضرورت مند لوگوں تک پہنچا دیا جائے۔ موجودہ حالات میں اس کے اہتمام کی بھی بہت ضرورت ہے۔ رمضان میں سخاوت کی ایک صورت راشن کی فراہمی ہے۔ ہوش رُبا مہنگائی کے اس عالم میں کہ انسان کی بہت بنیادی غذائی ضروریات بھی اتنی مہنگی ہوگئیں کہ مساکین کی پہنچ سے دور ہوگئیں تو اس کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔ نبئ اکرم ﷺ نے رمضان المبارک کو «شَهْرُ الْمُوَاسَاة» یعنی ہمدردی کا مہینا بھی قرار دیا ہے۔ تو ہماری ہمدردی

کا مستحق وہ سفید پوش طبقہ ہے جو مہنگائی کی چکی میں پس رہا ہے۔ ہمیں وہ حدیثِ قدسی یاد رکھنا چاہیے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ بندے سے سوال کرے گا: يَا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي ”اے بندے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا تو نے مجھے کھلایا نہیں ہے“۔ بندہ کہے گا: اے میرے رب! میں تجھے کیسے کھلاتا؟ تُو تو سب جہانوں کا رب ہے۔ اللہ فرمائے گا: أَمَا عَلِمْتَ أَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلَانٌ، فَلَمْ تُطْعِمْهُ؟ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّكَ لَوْ أَطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي ”کیا میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا نہیں مانگا تھا؟ تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا، اگر تو اسے کھلاتا تو اسے میرے پاس پالیتا“۔(مسلم) اس طرح کا مکالمہ پانی اور لباس کے بارے میں بھی اس روایت میں نقل ہوا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ماہِ مبارک میں مالی صدقات کا اہتمام کرتے ہوئے محتاجوں اور ضرورت مندوں کی حاجات پوری کرنے کی کوشش کریں۔ یہ وہ افضل صدقہ ہے جس کی خبر ہمارے رسول ﷺ نے دی تھی جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا: «صَدَقَةٌ فِيْ رَمَضَانَ» (ترمذی) ”رمضان میں صدقہ کرنا“۔

* * * * *

مولانا محمد اقبال
رکنِ شعبہ تحقیق وتصنیف

عباد الرحمٰن کی خصوصیت: قرآنی آیات سے اثر پذیری

سورۃ الفرقان آیت: ۷۳

﴿وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِم لَم يَخِرُّوا عَلَيهَا صُمًّا وَّعُميَانًا﴾

"اور جب انھیں اپنے رب کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گرتے"۔

تفسیر وتوضیح

سورۃ الفرقان میں عباد الرحمٰن یعنی اللہ تعالیٰ کے مخصوص اور مقبول بندوں کے ان اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ جن سے متّصف ہو کر کوئی شخص حق باری تعالیٰ کے خاص اور ممتاز بندوں یعنی "عباد الرحمٰن" میں شامل ہو سکتا ہے۔ آیت کے زیرِ مطالعہ حصے میں ایک مزید وصفِ خاص کا ذکر ہے اور وہ ہے " اللہ تعالیٰ کی آیاتِ مبارکہ سے اثر پذیری یعنی اللہ کی آیات سن کر ان کے ایمان ویقین اور تعمیل واطاعت میں اضافہ ہو جانا"۔

خرور یعنی گرنے کا مفہوم

﴿وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِاٰيٰتِ رَبِّهِم لَم يَخِرُّوا عَلَيهَا صُمًّا وَّعُميَانًا﴾ "اور جب انھیں اپنے رب کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان پر بہرے اور اندھے بن کر نہیں گرتے"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ جب انھیں ان کے پروردگار کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے، تو

وہ ان آیات پر اندھے بہرے بن کر گرتے نہیں، یعنی غافل اور بے بصیرت لوگوں کی طرح ایسا رویہ اختیار نہیں کرتے کہ گویا انھوں نے سنا اور دیکھا ہی نہیں مفسرین اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں: لَمْ يَتَغَافَلوا عنها، كَأَنهُم صُمٌّ لَمْ يَسْمَعُوها وعُمْيٌ لَمْ يَبْصُروها بَلْ وَعَتْها قلوبُهم وتفتَّحَتْ لها بَصائِرُهم فَخَرُّوا للهِ ساجِدينَ مُطيعينَ (التفسير الميسر) ”عباد الرحمٰن کو جب آیات سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان آیات کی جانب سے غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتے، کہ خدانخواستہ وہ بہرے بن جاتے ہیں اور انھیں سنتے نہیں اور اندھے بن کر انھیں دیکھتے نہیں بلکہ ان کے دل انھیں سمجھتے ہیں اور ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور وہ اللہ کے حضور سجدے اور اطاعت میں گر جاتے ہیں“۔

مندرجہ بالا تفسیر سے بھی واضح ہوتا ہے اور علامہ زمخشری رحمہ اللہ نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ آیتِ مبارکہ میں گرنے کا لفظ اپنے لغوی معنی میں نہیں بلکہ محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْها ليس بنفيٍ لِلْخُرُورِ وإنما هو إثباتٌ له ونفيٌ لِلصَّمَمِ وَالْعَمْيِ كما تقول: لا يلقاني زيدٌ مُسَلِّمًا هو نفيٌ لِلسّلامِ لا لِلِّقاء (الكشاف عن حقائق غوامض التنزيل، ج:۳، ص:۲۹۵) ”یہاں لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْها میں خرور یعنی گرنے کی نفی نہیں ہو رہی، بلکہ اس کا اثبات ہو رہا ہے، نفی یہاں بہرے پن اور اندھے پن کی ہو رہی ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں: لا يلقاني زيد مسلما، اس میں ملاقات کا انکار نہیں بلکہ سلام کا انکار ہے“۔ پس آیت کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ایسے نہیں ہیں جو اللہ کی آیات سن کر ان کی طرف متوجہ نہ ہوں بلکہ سمیع و بصیر انسان کی طرح ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں اور احکامِ الٰہیہ کے سامنے خود کو گرا بلکہ بچھا دیتے ہیں اور ان کی پیروی اختیار کرتے ہیں۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے اسی طرزِ عمل کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الحدید:۱۶) ”کیا اہلِ ایمان کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں، اللہ کی یاد اور اس حق کے لیے جو نازل ہوا“ قرآن کریم میں ایک اور جگہ مومنین کی یہی صفت یوں بیان کی گئی ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُه زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾ (الانفال:۲) ”مومن تو وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر ہوتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور ترقی دیتی ہیں اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں“۔

احکامِ خداوندی کی تعمیل بصیرت کے ساتھ

پچھلی تفصیل سے ظاہر ہے کہ اس آیت میں ایک تو یہاں مومنین کے عمومی رویے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اہلِ کفر کی طرح آیاتِ الٰہیہ کی تعمیل سے انکار اور ان کے مقابل سرکشی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اللہ کی آیات کی اطاعت و پیروی کرتے ہیں۔ ان آیات میں اہلِ ایمان کے ایک خاص وصف کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے وہ اندھوں بہروں کی طرح بغیر سوچے سمجھے اور بغیر دیکھے بھالے آیتوں پر عمل کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ پورے تَیَقُّظ اور احساسِ ذمے داری کے ساتھ ان کی حکمتوں میں غور کرتے ہیں اور سوچ سمجھ کر ان کی پیروی کرتے ہیں۔ درحقیقت اسلامی تعلیمات کی اساس وبنیاد ایمان ویقین پر استوار ہے جو اپنے اعتدال، اپنے فطری محاسن وخوبیوں کی بدولت انسانی ذہن وفکر کو اپیل کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ روشن ضمیر اور پاک باطن نفوس جن کے اندر حق کی قبولیت کی استعداد ہوتی ہے، وہ پوری بصیرت کے ساتھ احکامِ الٰہیہ سن کر ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں اور انھیں پوری توجہ سے سنتے اور حرزِ جان بناتے ہیں۔

اس آیتِ مبارکہ سے یہ بات بھی پتا چلتی ہے کہ تحقیق وجستجو کا یہ حکم دینی اور دنیوی معاملات میں یکساں اہمیت کا حامل ہے۔ یہ حکم جس طرح احکامِ الٰہیہ اور امورِ دین میں ضروری ہے کہ یہاں بغیر تحقیق کے اندھے بہروں کی طرح امورِ دین پر گرنا مذموم عمل ہے، اسی طرح دنیوی امور میں بھی یہی حکم ہو گا۔ کیونکہ دین کے معاملات پر عمل کرنا واجب اور مقدم ہے، تو جب وہاں یہ کہا گیا کہ بغیر تحقیق کے عمل نہیں کرنا چاہیے تو دنیوی معاملات میں عمل کوئی فرض واجب تو ہے نہیں، اس لیے یہاں بطریقۂ اولیٰ جلد بازی سے بچنا چاہیے۔ لہٰذا اس آیتِ مبارکہ میں ایک بہترین حکمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ کسی کام کی حقیقت پر غور کیے بغیر

اسے انجام نہیں دینا چاہیے اور اسی طرح کسی شخص کے خوش نما نعروں پر جب تک اس کی حقیقت کا پورا پورا علم نہ ہو اندھا دھند اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا بغیر تحقیق اس پر آنکھیں بند کر کے عمل پیرا نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر معاملے میں اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ جب تک کسی دینی یا دنیوی امر کا پورا علم نہ ہو اس پر بے بصیرتی کے ساتھ گرنا نہیں چاہیے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے اوصافِ حمیدہ اور بامقصد زندگی کے آداب میں سے ہے، جیسا کہ حضرت شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا: ولا ينبغي للمؤمن أن يكون إِمَّعَةً بل يكون على بصيرة من أمره ويقين واضح بين. (ابنِ کثیر، ج:۶، ص:۱۱۹) ”مومن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ بے سمجھے کسی کام میں لگ جائے بلکہ اس پر لازم ہے کہ اپنے کام سے پوری طرح باخبر ہو اور بصیرت کے ساتھ اسے بجالائے“۔

احکامِ دین کو اسلاف کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے

آیتِ مبارکہ میں بیان کردہ ”سوچ و سمجھ“ کے وصف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہلِ ایمان اپنے ہی ”سوچ بچار“ کو دین کی سمجھ و تشریح کا ماخذ سمجھ کر اسلاف امت سے الگ راستہ اختیار کرلیں۔ بلکہ فہمِ آیات و احکام میں اسلاف کے طریق پر چلنا بھی اسی حکمت و بصیرت کا تقاضا ہے جس کا ذکر ماقبل ہو چکا۔ اس لیے کہ نقلی و عقلی دلائل سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو بغیر احادیث کے سمجھا نہیں جاسکتا اور قرآن و حدیث کا وہی فہم لائقِ اعتبار ہے جو اجماع و تواترِ امت سے ثابت ہو۔ لہٰذا احکامِ دین کو صرف اپنے مطالعے سے سمجھنا اور پھر اپنی رائے پر اصرار کرنا درست طرزِ عمل نہیں ہے، بلکہ اسلاف کی تشریحات کی روشنی میں سمجھنا اور پھر ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر کے ضمن تحریر فرماتے ہیں: ”آیاتِ مذکورہ میں جس طرح اس امر کی سخت مذمت ہے کہ آیاتِ الٰہیہ کی طرف توجہ ہی نہ دیں، اندھے بہروں کا سا معاملہ کریں، اسی طرح اس کی بھی مذمت ہے کہ توجہ تو دیں اور عمل بھی کریں مگر بے سمجھے بے بصیرتی کے ساتھ اپنی رائے سے جس طرح چاہیں عمل کرنے لگیں۔ ابنِ کثیر رحمہ اللہ نے ابنِ عون رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے حضرت شعبی رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اگر میں کسی مجلس میں

پہنچوں جہاں لوگ سجدے میں پڑے ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ کیسا سجدہ ہے تو کیا میں بھی ان کے ساتھ سجدے میں شریک ہو جاؤں۔ حضرت شعبی رحمہ اللہ نے فرمایا نہیں۔ مومن کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ بے سمجھے کسی کام میں لگ جائے بلکہ اس پر لازم ہے کہ بصیرت کے ساتھ عمل کرے۔ جب تم نے وہ آیتِ سجدہ نہیں سنی جس کی بنا پر یہ لوگ سجدہ کر رہے ہیں اور تمھیں ان کے سجدے کی حقیقت بھی معلوم نہیں تو اس طرح ان کے ساتھ سجدے میں شریک ہونا جائز نہیں۔ اس زمانے میں یہ بات تو قابلِ شکر ہے کہ نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقے میں قرآن پڑھنے اور اس کے سمجھنے کی طرف کچھ توجہ پیدا ہوئی ہے اور اس کے تحت وہ بطورِ خود قرآن کا ترجمہ یا کسی کی تفسیر دیکھ کر قرآن کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں مگر یہ کوشش بالکل بے اصول ہے۔ اس لیے قرآن کو صحیح سمجھنے کے بجائے بہت سے مغالطوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اصول کی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی معمولی سے معمولی فن بھی نری کتاب کے مطالعے سے کسی کو معتد بہ نہیں حاصل ہو سکتا جب تک اس کو کسی استاد سے نہ پڑھے۔ معلوم نہیں قرآن اور علومِ قرآن ہی کو کیوں ایسا سمجھ لیا گیا ہے کہ جس کا جی چاہے خود ترجمہ دیکھ کر جو چاہے اس کی مراد متعیّن کرے۔ یہ بے اصول مطالعہ جس میں کسی ماہر استاد کی رہنمائی شامل نہ ہو، یہ بھی آیاتِ الٰہیہ پر اندھے بہرے ہو کر گرنے کے مفہوم میں شامل ہے‘‘۔ (معارف القرآن، ج:۶، ص:۵۱۰) چونکہ لوگ نئی چیزوں کی طرف لپکتے ہیں، اس لیے آج کل بعض لوگ دانشور بن کر مختلف خوش نما عنوانات کے تحت دینی امور کے متعلق خود ساختہ آرا پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے نوجوان نسل انھیں امت کا مسیحا سمجھ کر ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اس آیتِ مبارکہ سے شاذ اور نادر آرا سے بچنے اور اپنی روایت سے جڑے رہنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

* * * * *

ابنِ عباس
معاون قلم کار

ہماری بدحالی کی وجوہات

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: «إِذَا ظَهَرَ الزِّنَا وَالرِّبَا فِي قَرْيَةٍ، فَقَدْ أَحَلُّوا بِأَنْفُسِهِمْ عَذَابَ اللهِ». (مستدرک حاکم)

''حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: جب کسی بستی میں بدکاری اور سود پھیل جائیں تو وہ لوگ اللہ کے عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں''۔

تشریح

عام طور پر ہم انسان دنیا کے اچھے برے حالات کو ظاہر کی آنکھ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ تمام ظواہر کچھ باطنی اور غیر مرئی اثرات سے ظہور پاتے ہیں۔ ان اثرات میں ایک اثر برکت کہلاتا ہے کہ اللہ ہماری تھوڑی کوششوں کو بھی بڑے نتیجے کے ظہور کا سبب بنا دے۔ نتیجے کا یہ اچھا ظہور یا برکت اخلاقی اصول پر کھڑا ہے یعنی اگر انسان اپنا کردار ایسا بنا لے جو اللہ کا پسندیدہ ہو تو اللہ کی طرف سے اچھے نتائج ظاہر ہوں گے اور اگر انسان دنیا میں اللہ کا ناپسندیدہ کردار بن کر رہے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت و برکت اس سے منھ موڑ لیتی ہے اور خراب حالات ظہور پاتے ہیں جسے ہم بے برکتی بھی کہہ سکتے ہیں اور عذابِ الٰہی بھی۔ یہ عام اخلاقی اصول ہے خاص حالات میں آزمائش یا استدراج کا ظہور بھی ہوتا ہے یعنی نیک لوگوں پر حالات خراب آ جائیں تو یہ آزمائش ہے اور برے لوگوں پر اچھے حالات آتے رہیں تو یہ استدراج یعنی ڈھیل ہے۔ لیکن عام اخلاقی اصول

یہی ہے کہ برے کردار پر برے حالات آتے ہیں اور اچھے پر اچھے حالات آتے ہیں۔ یہ اخلاقی اصول قرآن کریم میں کئی جگہ بیان ہوا:﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ﴾(الاعراف:۹۶)''اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے توہم ان پر آسمان وزمین سے برکات نازل کرتے''۔ایک جگہ فرمایا:﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾(الطلاق:۲،۳)''جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کرے گا اور اس کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے وہ سوچ بھی نہیں سکتا''۔﴿وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ وَما أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ أَرْجُلِهِمْ﴾ (المائدہ:٦٦)''اور اگر وہ تورات، انجیل اور اللہ کے نازل کردہ (احکام) کو قائم کرتے تو وہ کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی''۔برکت و انعام اور بے برکتی اور عذاب کا یہ اصول ویسے تو ہر عمل پر لاگو ہوتا ہے لیکن حدیثِ مذکور میں دو گناہوں کا بطورِ خاص ذکر آیا اور وہ بدکاری اور سود خوری ہیں:''جب کسی بستی میں بدکاری اور سود پھیل جائے تو وہ لوگ اللہ کے عذاب کے مستحق ہوجاتے ہیں''۔جہاں تک پہلے جرم ''زنا'' کی بات ہے تو قرآنِ پاک میں جابجا اس کی مذمت کی گئی ہے۔سرِدست ایک آیت کا مطالعہ کرتے ہیں:﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا﴾(بنی اسرائیل:۳۲)''اور زنا کے قریب نہ جاؤ، اس لیے کہ یہ بڑی برائی اور بہت برا راستہ ہے''۔اس آیت میں زنا کو'' برا راستہ'' قرار دیا گیا اگرچہ اس کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن یہ مطلب واضح ہے کہ یہ فعلِ بد اور برا راستہ انسان کو کسی بری منزل پہ پہنچا کر چھوڑتا ہے تبھی تو اسے برا راستہ قرار دیا گیا۔'' برے راستے'' زنا کی ایک بری منزل بیماریوں کا پھیلنا ہے۔صحیح حدیث میں ہے:«لَمْ تَظْهَرِ الْفَاحِشَةُ فِي قَوْمٍ قَطُّ، حَتَّى يُعْلِنُوا بِهَا، إِلَّا فَشَا فِيهِمُ الطَّاعُونُ، وَالْأَوْجَاعُ الَّتِي لَمْ تَكُنْ مَضَتْ فِي أَسْلَافِهِمُ الَّذِينَ مَضَوْا» (ابنِ ماجہ)''کسی قوم میں بدکاری نہیں پھیلتی یہاں تک کہ کھلے بندوں ہونے لگے تو ان میں طاعون اور دوسری بیماریاں پھیل جاتی ہیں جو ان کے باپ دادوں نے سنی تک نہ

تھیں‘‘۔تو بدکاری سے صحت کے مسائل پیدا ہوتے ہیں اور صحت کے یہ مسائل دوسرے مسائل کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔بیمار لوگ ملکی پیداوار میں کیا حصہ لیں گے الٹا بوجھ بن جاتے ہیں۔پھر بدکاری سے لوگوں کی قوتِ کار اور قوتِ ارتکاز پر برا اثر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اپنی صلاحیتوں کا صحیح استعمال نہیں کر سکتا۔انجامِ کار بدکاری ملکی و قومی نقصان کا ذریعہ بنتی ہے۔بعض روایات میں بھی بدکاری کا تعلق معاشی بدحالی سے جوڑا گیا ہے:«وَإِذَا ظَهَرَ الزِّنَا ظَهَرَ الْفَقْرُ وَالْمَسْكَنَةُ»(مسند البزار)’’جب زنا عام ہو جائے تو غریبی اور محتاجی عام ہو جاتی ہے‘‘۔«الزِّنَا يُورِثُ الْفَقْرَ» (شعب الایمان)’’زنا فقر پیدا کرتا ہے‘‘۔اگرچہ ان روایت میں ضعف پایا جاتا ہے لیکن ان میں بیان کردہ مفہوم کی تائید تفسیرِ قرآن سے ہوتی ہے جس کی طرف اشارہ علامہ صنعانی نے التنویر شرح الجامع الصغیر میں اشارہ کیا ہے۔وہ یوں کہ زنا، نکاح کا متضاد ہے اور قرآنِ کریم میں نکاح کو باعث برکت بتایا گیا ہے:﴿وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَى مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبادِكُمْ وَإِمائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا فُقَراءَ يُغْنِهِمُ اللهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللهُ واسِعٌ عَلِيمٌ﴾(النور:۳۲)’’تم میں سے جن (مردوں یا عورتوں) کا اس وقت نکاح نہ ہو، ان کا بھی نکاح کراؤ، اور تمھارے غلاموں اور باندیوں میں سے جو نکاح کے قابل ہوں، ان کا بھی۔اگر وہ تنگ دست ہوں تو اللہ اپنے فضل سے انھیں بے نیاز کر دے گا۔اور اللہ بہت وسعت والا ہے، سب کچھ جانتا ہے‘‘۔رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کے بارے میں خبر دی کہ اللہ ان کی بالضرور مدد کرتا ہے ان میں نکاح کرنے والا بھی ہے فرمایا:«اَلنَّاكِحُ يُرِيدُ الْعَفَافَ»(مسندِ احمد)’’ وہ شخص جو اپنی عفت کی حفاظت کی خاطر نکاح کرے‘‘۔انھی دلائل کی رو سے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں:الْتَمِسُوا الْغِنَى فِي النِّكَاحِ ’’مالداری کو نکاح کے ذریعے تلاش کرو‘‘۔تو جب ایک شخص نکاح کا راستہ چھوڑ کر بدکاری کا راستہ اختیار کرتا ہے تو گویا وہ اللہ کی مدد اور مالداری کا راستہ چھوڑ کر فقر اختیار کر رہا ہے۔

حدیثِ زیرِ مطالعہ میں دوسرا جرم سود خوری ہے۔اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:﴿يَمْحَقُ

اللهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ﴾(البقرہ:٢٧٦) ''اللہ سود کو تباہ کرتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گناہ گار کو پسند نہیں کرتا''۔ تباہ کرنے کے تین مطلب بیان کیے گئے: ایک تو یہ کہ سود کا مال خرچ کرنے پر کوئی نیکی نہیں ملے گی، دوسرا یہ کہ اس سے مال بالکلیہ تباہ ہو جائے اور تیسرا یہ کہ اس کی برکت ختم ہو جائے فائدہ مند نہ ہو سکے۔ اب اگر ہم اپنی موجودہ معاشی ابتری کی طرف دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ بیرونی اور اندرونی سود کی وجہ سے ہماری معیشت برکت سے محروم اور روبہ زوال ہے۔ آیتِ مندرجہ بالا میں سود کے مقابل صدقات کو لایا گیا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معیشت کی بنیاد سود کے بجائے زکاۃ و صدقات ہے۔ ایک دوسری آیت میں بھی سود اور زکاۃ کا تقابل کیا گیا: ﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَ فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِنْدَ اللهِ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ﴾ (الروم:٣٩) ''اور جو روپیہ تم سود پر دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں جا کر بڑھتا رہے وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتا اور جو تم اللہ کی رضا کے لیے زکاۃ ادا کرتے ہو تو وہی ہیں جو بڑھانے والے ہیں''۔ نبی کریم ﷺ نے سود کے بارے میں فرمایا: «الرِّبَا وَإِنْ كَثُرَ فَإِنَّ عَاقِبَتَهُ تَصِيرُ إِلَى قُلٍّ» (مستدرک حاکم) ''سود جتنا بھی بڑھ جائے، پر بے شک اس کا انجام قلت ہی ہے''۔ ایک روایت جو ہمارے زیادہ متعلق ہے کہ ہمارے وزیرِ خزانہ نے سود ختم کرنے کے اعلان کے بعد شرحِ سود بڑھادی ہے، فرمایا: «مَا أَحَدٌ أَكْثَرَ مِنَ الرِّبَا، إِلَّا كَانَ عَاقِبَةُ أَمْرِهِ إِلَى قِلَّةٍ» (ابنِ ماجہ) ''کوئی شخص سود کو جتنا بھی زیادہ کر لے، انجام اس کا قلت ہی ہے''۔ حاصل یہ کہ ہماری معاشی بدحالی کی دیگر وجوہات کے ساتھ ہماری بداعمالی بھی ایک بڑی وجہ ہے تو حکومت و عوام دونوں کو توبہ و اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی بارگاہ میں سچی توبہ کی توفیق نصیب فرمائیں، آمین۔

* * * *

گفتگو: ڈاکٹر رشید ارشد

ٹرانسکرپشن: عبداللہ جان

ٹیکنالوجی نے ہمیں کیسے تبدیل کیا؟

قسط نمبر ۲

ٹیکنالوجی کے روایتی اور جدید تصور میں یہ فرق کیسے آیا اور وہ وجہ کیا ہے کہ ٹیکنالوجی کے اندر دو ڈھائی سو سال میں یہ غیر معمولی تبدیلیاں آئیں، یہ اس سے پہلے کیوں نہیں آئیں؟ ماڈرن ٹیکنالوجی کی تاریخ اتنی لمبی نہیں ہے، آج سے تین ہزار سال پہلے کے آدمی اور آج سے تین سو سال پہلے کے آدمی میں کوئی اتنا زیادہ فرق نہیں تھا۔ ڈارون کی تھیوری کہ بندر سے بتدریج انسان بن گیا، پھر اس تھیوری کی بنیاد پر یہ کہنا کہ شروع میں انسان بالکل وحشی تھا، غاروں میں رہتا تھا اور پتے کھاتا تھا، اس کو میں نہیں مانتا۔ اس لیے کہ میں اس تھیوری کو قرآنِ مجید کی تعلیمات کی روشنی میں تصورِ انسان کی بنیاد پر مان ہی نہیں سکتا۔ قرآنِ مجید کی تعلیمات کے مطابق پہلا انسان پوری طرح مہذب تھا اور یہ صرف انسان نہیں تھا بلکہ انسانِ کامل تھا، قرآن کی تعلیمات کے مطابق ہر پیغمبر انسانِ کامل ہوتا ہے اور سب سے پہلے انسان حضرتِ آدم پیغمبر تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کہنا کہ وہ بالکل جنگلیوں کی طرح زندگی بسر کر رہے تھے درست نہیں ہے۔ ہم فلسفہ پڑھاتے ہوئے کبھی سوچتے ہی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ میں فلسفے کا ایک طالب علم ہوں اور فلسفہ پڑھاتا بھی ہوں، یہ بتایا جاتا ہے کہ فلسفے کا آغاز Thales سے ہوا اور Ionian سے ہوا، لوگ جنگلی تھے، پھر انھوں نے سوچنا شروع کیا وغیرہ وغیرہ۔ مذہب میں تو اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فلسفے کے بنیادی سوالات ”میں کہاں سے آیا ہوں، کون ہوں، مجھے کدھر جانا ہے، میری حقیقت کیا ہے، کائنات کیا ہے، اس کا مبدا کیا ہے، اس کا میعاد کیا

ہے، علم کسے کہتے ہیں، خیر اور شر کسے کہتے ہیں؟" یہ سارے وجودی سوال ہیں، جس طرح یہ سارے سوالات فلسفے کے ہیں اسی طرح یہ سارے سوالات مذہب کے بھی ہیں۔ اور مذہب ان سارے سوالات کا جواب دے چکا ہے، مذہب کی رو سے پہلا آدمی پوری طرح "ارتقا شدہ" تھا اور وہ حضرت آدم تھے جو پیغمبر تھے اور وہ لوگوں کو اللہ کی رہنمائی کی ہدایت دیتے تھے۔ تو یہاں ڈارون کی تھیوری کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ آپ تو جانتے ہیں نا کہ مذہبی تاریخ کا جو انسانی تصور ہے، اس میں انسانیت کی کل عمر کوئی چھے ہزار برس ہے۔ جدید سائنس ہمیں کائنات کے بارے میں اربوں کھربوں سال کی بات بتاتی ہے، لیکن انسانوں کے بارے میں جس کو وہ Homo-sapien کہتی ہے، اس کے بارے میں بھی یہ کہتی ہے کہ اس کو لاکھوں سال ہو گئے۔ تو یہ سوال کیوں نہیں اٹھتا کہ لاکھوں سال لوگوں نے ایک خاص ڈھنگ سے گزارے، تو کیا وجہ ہے کہ دو سو ڈھائی سو سال پہلے ایسی تبدیلیاں آئیں کہ جس میں ٹیکنالوجی نے ایک غیر معمولی ترقی کی؟ بہر حال، اصل بات یہ ہے کہ بنیادی تبدیلی تصورِ حقیقت، تصورِ انسان اور تصورِ کائنات میں آئی۔ اور یہی انسان کے تین بڑے سوالات تھے، کہ حقیقت/خدا کیا ہے؟، انسان کیا ہے؟، کائنات کیا ہے؟ اسی سے اس کا ورلڈ ویو متعیّن ہوتا ہے۔ تو پہلے ان سوالات کے بارے میں جو تصورات تھے وہ روایتی تھے: مثلاً خدا کیا ہے؟ خدا اس کائنات کا خالق ہے۔ حقیقت کیا ہے؟ حقیقت اصل میں روحانی ہوتی ہے۔ آپ غور کریں کہ فلسفے کی بنیادی تعریف شروع سے یہ چلتی آ رہی ہے: love of wisdom، اور وِزڈم کا ایک مطلب تھا صورت سے گزر کر حقیقت تک پہنچ جانا، اور دوسرا مطلب یہ تھا کہ کثرت سے گزر کر وحدت تک پہنچ جانا۔ حکمت اصل میں اسے کہتے تھے کہ انسان دنیا میں رہتا ہے، دنیا عالمِ کثرت ہے، یعنی عالمِ صورت ہے، لیکن اس سے ماورا ایک اور عالم ہے جو عالمِ حقیقت ہے۔ اس لیے آپ کبھی غور کیجیے کہ جو مذہب اور فلسفے کے بڑے بڑے سوالات تھے یہ اصل میں انسان کے بڑے سوالات تھے، انسانوں نے ہمیشہ سے تین چیزوں کو کھوجا ہے اور انھیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلی چیز: اس نے کوشش کی ہے وحدت تک پہنچنے کی اور یہ انسان کا ایک پُرانا آدرش ہے، دوسرا، انسان نے کوشش کی ہے ابدیت کے حصول کی۔ اور تیسرا، انسان نے کوشش کی ہے ماورائیت کی یعنی انسان اپنے اس وجود سے اوپر اُٹھ سکے، ٹرانسینڈ کر سکے۔ آپ غور کریں آج سے تین چار سو

سال پہلے تک ان تینوں چیزوں کو لوگوں نے جس Locale میں locate کیا ہے وہ یہ دنیا نہیں ہے اس دنیا سے ماورا ایک عالم ہے۔ فلسفے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی پیدائش یونان اور ایشیاے کوچک میں ہوئی ہے، اس سے پہلے خرافات اور افسانوں کے تصورات کے تحت لوگ زندگی گزارتے تھے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کا کُھرا دیوتاؤں کے عالم میں ڈھونڈتے تھے کہ اس عالم میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے مؤثرات ہم پر ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس دنیا کی جو واحد حقیقت ہے وہ اس دنیا سے باہر پائی جاتی ہے۔ جب فلسفہ وجود میں آیا تو سب سے پہلے فلسفی نے کہا کہ کائنات سے باہر نہیں، ہمیں اس دنیا کہ اندر ہی اس کا مادّہ اور وحدت تلاش کرنی ہے۔ جو پہلا فلسفی کہلاتا ہے Thales، اس نے کہا کہ وہ مادّہ پانی ہے۔ جبکہ Heraclitus نے کہا کہ وہ آگ ہے، Pythagoras نے کہا کہ وہ نمبر ہے۔ اس کے علاوہ کسی نے کہا کہ ہوا ہے، کسی نے کہا وہ Ether ہے، کسی نے کہا کہ وہ ایک ایسا میٹریل ہے جو نا قابل تقسیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وحدت وہ بھی تلاش کر رہے تھے، اب جدید آدمی بھی اسے اس دنیا میں تلاش کر رہا ہے۔ جس طرح پہلے وہ فلسفے کے ذریعے سِنگولیرٹی کی تلاش میں تھے، اب وہ چاہ رہے ہیں کہ ٹیکنالوجی کے ذریعے وہ اس تک پہنچ جائیں۔ دوسری انسان کی بہت بڑی آرزو ہے خلود حاصل کرنا اور قرآنِ مجید میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جب جنت میں تھے تو انھیں بھی ابلیس نے اس راستے سے بہکایا، ابلیس نے ان سے کہا: ﴿قَالَ يَا آدَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ﴾ ”کہنے لگا: اے آدم! کیا میں تمھیں ایک ایسا درخت بتاؤں جس سے جاودانی زندگی اور وہ بادشاہی حاصل ہو جاتی ہے جو کبھی پرانی نہیں پڑتی؟“۔ اس کا مطلب ہے کہ خلود، ابدیت انسان چاہتا ہے، لیکن پہلے انسان یہ خیال کرتا تھا یہ خلود اس دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتی، یہ اس دنیا سے ماورا ایک اور عالم میں ملے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب میں جنت اور جہنم کا جو تصور ہے، اس میں بھی خلود ہے، کیونکہ یہ انسان کی بڑی آرزو ہے۔

اور انسان کی تیسری آرزو اور خواہش ماورائیت یعنی اپنے وجود سے اوپر اٹھ جانا ہے، انسان کی خواہش رہی ہے کہ اپنے اس مادی وجود کو ٹرانسینڈ کر جائے۔ اس کے لیے بھی ہمیشہ مذہب کی طرف دیکھا گیا، یہاں

بھی ایک ٹرانسنڈنس تو وہ ہے جو دنیا کے بعد جنت میں حاصل ہوگی کہ انسان اپنی جبلتوں اور بہت سی چیزوں کو ٹرانسینڈ کر جائے گا۔ اور ایک ٹرانسنڈنس دنیا میں لوگوں حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کے لیے انسان نے جس ڈسپلن کی طرف دیکھا اس کو آپ روحانیات یا تصوف کہہ سکتے ہیں، اس کے ذریعے بھی انسان اپنے آپ کو زمان و مکاں سے ماورا کر دیتا ہے:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زنّاری
نہ ہے زماں، نہ مکاں لا الہ الا اللہ

اور ایک شاعر نے کہا:

عقل گوید شش جہت حد است و بیروں راہ نیست
عشق گوید ہست راہ و رفتہ ام من بارہا

"عقل نے کہا کہ شش جہت حد ہے اور اس سے باہر کوئی راستہ نہیں ہے، جبکہ عشق نے کہا کہ راستہ ہے اور میں کئی بار اس راستے سے گزرا ہوں"۔ یعنی عقل نے کہا کہ یہ جو شش جہات ہیں (آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں) بس یہ انسان کی حدود ہیں اس سے باہر جانے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ جبکہ عشق نے کہا کہ راہ ہے اور میں کئی مرتبہ اس راستے سے جا بھی چکا ہوں، یعنی ان جہات سے باہر تک میری رسائی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ وہ ایک روحانی سفر ہوتا ہے، آپ کو معلوم ہے نا کہ ہمارے صوفیا کے ہاں سیرِ افلاک بھی ہے، اسی طرح سیر الی اللہ اور اس کے مراحل ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی اس ٹرانسنڈنس کے لیے مادے یا دنیا کی طرف نہیں دیکھا۔ لیکن اب جدید دور میں وحدت کو بھی اور خلود کو بھی اور ماورائیت کو بھی کہاں کھوجا اور دیکھا جا رہا ہے، انھیں ٹیکنالوجی میں دیکھا جا رہا ہے۔ ایک صاحب بہت مشہور ہیں ٹیکنالوجسٹ بھی ہیں اور گوگل وغیرہ میں بہت اعلیٰ عہدوں پر رہے ہیں، ان کا نام ہے Raymond Kurzweil، ان کی کچھ کتابوں کے نام آپ کے سامنے لینا چاہتا ہوں یہ بتانے کے لیے کہ یہ جو ماڈرن ٹیکنالوجی ہے اس کے آدرش کیا ہیں۔ ان صاحب کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے: The Age of Intelligent Machines، یعنی جو انسان کی انٹیلی جنس کا تصور تھا، ان کا کہنا ہے کہ وہ ہم مشین کے اندر پیدا کر دیں گے۔ ایک اور کتاب ہے: The Age of

spiritual Machines، وہ جو ایک خیال تھا کہ انسان کا ایک بڑا امتیاز ہے کہ اس کے اندر ایک روح ہے ایک ڈیوائن اسپارک ہے، یہ صاحب کہہ رہے ہیں کہ مشین کے اندر بھی ہم یہ وصف پیدا کر دیں گے۔ پھر ایک کتاب کا نام ہے: Fantastic Voyage: Live Long Enough to Live Forever، ۲۰۰۴ء میں یہ کتاب آئی، اس میں انھوں نے ایک تھیوری پیش کی تھی کہ اگر آپ ۲۰۴۵ء تک اپنے آپ کو زندہ رکھ سکے تو اس کے بعد آپ امَر ہو جائیں گے، آپ کو موت نہیں آئے گی۔ اور دو طرح کے ٹیکنالوجیز پر کام ہو رہا ہے: ایک Bio Tech ہے اور ایک InfoTech ہے۔ Bio Tech کے ذریعے آپ کی جو باڈی ہے اس کو ہم Stem Cell کے ذریعے کلون کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اور پھر جو سب سے بڑا اور پرانا مسئلہ ہے، جو فلسفے کا بھی سب سے بڑا اور پرانا مسئلہ ہے، جسے Problem of Consciousness کہا جاتا ہے یعنی انسان کی identity کیا ہے، تو کہا کہ آپ کا جو بھی شعور ہے وہ ہم InfoTech کے ذریعے ایک مشین میں اپلوڈ کر دیں گے۔ اور جب آپ کا کلون تیار ہو جائے گا تو وہ ڈیٹا پھر وہاں سے ڈاؤنلوڈ کر دیں گے اور آپ کو ایک وجود دیا جائے گا جو ہمیشہ رہے گا کبھی ختم نہیں ہوگا۔ پھر ایک کتاب کا نام ہے: Transcend: Nine Steps to Living Well Forever، ٹرانسنڈ کرنا، جسم سے اوپر اٹھ جانا یا دنیا سے اوپر اٹھ جانا۔ پھر اس کی ایک اور کتاب ہے جس کا نام ہے: The Singularity is Near اب آپ دیکھ لیجیے جو تین باتیں میں نے بتائی تھیں ایک ہی آدمی کی کتابوں کے ٹائٹلز میں وہ تصورات موجود ہیں۔ جدید آدمی کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے اپنے آپ کو Maximize کرتے چلے جانا۔ اور آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر طرح کی رکاوٹوں کو دور کرنا، Freedom کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ Modern Freedom: content less چیز ہے یعنی ایسا نہیں ہے کہ آپ کو کیا چاہنا چاہیے، بس یہ ہے کہ جو کچھ بھی میں چاہنا چاہوں اس چاہت کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، ان کے لیے یہ اہم نہیں ہے کہ آپ کیا چاہتے ہیں، بلکہ اہم یہ ہے کہ جو بھی آپ چاہنا چاہتے ہیں آپ وہ چاہ سکیں۔ اب اس کے راستے میں رکاوٹیں کیا ہیں، تو جو سب سے بڑی رکاوٹ ہمیشہ سے رہی ہے وہ فزیکل رہی ہے، مٹیریل رہی ہے۔ اس طبعی اور مادی رکاوٹ کو ختم کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کا ڈول ڈالا گیا۔ رکاوٹ سے کیا مراد ہے، مثلاً انسان ایک

خاص فاصلے سے آگے نہیں دیکھ سکتا، ایک خاص دوری سے زیادہ سن نہیں سکتا، انسان زمین پر اچھلتا ہے تو اس کو نیچے آنا ہوتا ہے اوپر ہی اوپر نہیں جا سکتا۔ ان حدود کو ٹیکنالوجی کے ذریعے ختم کرنا ہے۔ لیکن یہ جو انسان کے اوپر سب سے بڑی فزیکل رکاوٹ لگی ہوئی ہے، وہ موت ہے۔ اب اصل میں یہی پروجیکٹ ہے، جس پر کام ہو رہا ہے، یعنی ایک تو longevity ہے کہ زندگی کو بڑھاتے چلے جائے، کیونکہ اصل میں اور کوئی عالم تو ان کے نزدیک ہے ہی نہیں، تو اس کا نتیجہ زندگی کو بڑھاتے چلے جانا ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ جیا جائے۔ لیکن یہ بھی ایک ناکافی کوشش ہے، اس لیے اصل مسئلہ ان کا خلود حاصل کرنا ہے۔

اور جس طرح میں نے شروع میں کہا تھا کہ انسان کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتا ہے اور تاریخ میں ایسے لوگ رہے ہیں جنھوں نے اس طرح کا اعلان کیا ہے، لیکن جدید آدمی گویا اجتماعی طور پر یہ اعلان کرنے جا رہا ہے۔ Yuval Noah Harari ایک بہت مشہور اسرائیلی تاریخ دان اور رائیٹر ہے، اس کی کتابیں آج کل فیشن میں ہیں، ہر دور میں ہمارے یہاں کے ملحدین؛ کوئی ایک آدھ نام ہوتا ہے جس کی مالا وہ جپتے رہتے ہیں تو آج کل ہراری ان کی زبانوں پر ہے جیسے پچھلی صدی کا آدھا نصف برٹرنڈ رسل کے نام پہ گزر گیا، اس سے قبل کارل مارکس تھا۔ ۲۰۰۰ء کے بعد یہ جگہ رچرڈ ڈاکنز کو مل گئی۔ اور کوئی پانچ چھے سال ہوئے ہیں کہ یہ ہراری آگیا ہے اور ہر جگہ اسی کی شہرت ہے۔ اس نے ارتقا کے ڈسکورس پر مبنی، پوری انسانیت کی تاریخ لکھ دی ہے۔ اس نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر sapiens کے نام سے ایک تاریخ لکھ دی۔ اسی طرح ایک کتاب Human of the future کے نام سے بھی لکھی۔ اسی طرح اس نے ایک کتاب لکھی، اس کتاب کا ٹائٹل تھا Homo Deus یعنی Man god۔ اور خدا تو چانکہ کوئی ہے نہیں، اور نطشے نے بھی اعلان کر دیا تھا معاذاللہ کہ God is dead، خدا مر گیا ہے۔ اب یہ کہا جانے لگا کہ خدا تو چونکہ ہے ہی نہیں تو ہم سب کو اپنی ذات میں چھوٹا موٹا خدا بننا ہے۔ اسی لیے ماڈرن ٹیکنالوجی کا ایک سافٹ ٹارگٹ ہے اور ایک ہارڈ ٹارگٹ ہے، سافٹ ٹارگٹ ہے لذّت کو بڑھاتے چلے جانا، انسانی آزادی کو بڑھاتے چلے جانا اور اس کا ہارڈ ٹارگٹ ہے وہ ہے خدا بننے کا عمل، خدا سے بغاوت بلکہ خدا بننے کی ایک چاہت۔

تو اب تک آپ حضرات کے سامنے جو معروضات پیش کی گئیں وہ یہ کہ ہم کیا ہیں؟ دوسرا میں نے یہ

کہا تھا کہ روایتی طور پر ٹیکنالوجی کے کیا مقاصد بیان کیے جاتے تھے؟ تو یہاں سب سے اوپر ہے معرفتِ حقیقت، اس کے بعد ایک اخلاقی وجود بننا، اس کے بعد ہے کہ انسان طاقت حاصل کرے۔ افلاطون کے ہاں بھی یہ تینوں چیزیں ہمیں ملتی ہیں، اس نے انسان کے بارے میں کہا کہ تین طرح کی چیزیں انسان میں ہیں؛ ایک reason، ایک will اور ایک appetite ہے۔ تو reason کا تعلق حقیقت سے ہے اور will کا تعلق کچھ کرنے اور بننے سے جبکہ appetite جس کو ہم شہوتیں کہتے ہیں، اس کا تعلق ہے پاور سے، کہ وہ پاور انسان نے حاصل کرنی ہے۔

اب تھوڑی سی بات اس پر کرتے ہیں کہ جو سائنس اور ٹیکنالوجی کا ایک فرق لوگ بیان کرتے تھے کہ پہلے انسان کا تعارف یہ تھا کہ یہ Homo-Depicter ہے، یعنی دنیا کو بیان کرتا ہے کہ دنیا کیا ہے۔ یہ پروجیکٹ گویا سائنس کے پاس تھا اور انسان کا ایک اور تعارف تھا کہ وہ Homo-Faber ہے، Tool maker ہے کہ وہ چیزوں کو بناتا ہے، جس کو ہم نے کہا کہ وہ 'ٹیکنے' کے ذریعے بناتا ہے، یہ دو چیزیں گویا ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ لیکن ایک چیز اس سے بھی اوپر تھی، وہ تھی Homo-Sapien یعنی man the wise اوپر ہے۔ اس کے بعد دنیا کو جاننا یہ Depicter ہے، اور اس کو اپنے مصرف میں لانا، اپنے کام میں لانا Homo-Faber ہے۔ لیکن ماڈرن ٹیکنالوجی میں ایسا لگتا ہے کہ Homo-Depicter اور Homo-Faber آپس میں مل گئے ہیں، اس لیے اب Pure science اس طریقے سے نہیں پائی جاتی۔ پہلے لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ جو Pure science ہے، سائنس دان کا عمل بالکل ایسا ہی ہوتا ہے meditative قسم کا، اور جس طریقے سے ایک صوفی اپنی خانقاہ میں ہوتا ہے ویسا ہی عمل ایک سائنس دان کا اپنی لیبارٹری میں ہوتا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں رہا، اب آہستہ آہستہ Pure Science ختم ہوتی چلی جارہی ہے، جیسا فلسفے میں بھی Pure Philosophy بھی، جو Meta Physics تھی وہ آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے اور فلسفہ اب مغرب میں Applied Form میں زیادہ ہے۔ linguistic philosophy یا Biomedical ethics یا Business ethics یا Media ethics ہے، Pure philosophy ختم ہوتی جا رہی ہے۔ تو سائنس کے شعبے میں ہمارے بہت دوست سے باہر جانے کی

کوشش کرتے ہیں اور مختلف شعبوں میں جیسے ریاضی میں یا فزکس میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتے ہیں تو ان کے لیے مشکل ہوتی ہے، ان کو فنڈنگ نہیں ملتی، ان کو کوئی endowments نہیں ملتیں، ایسے کوئی پروگرامز نہیں ہیں جن کے ذریعے وہ پی ایچ ڈی کر سکیں۔ اس کا سبب کیا ہے کہ جو ٹیکنو سائنس ہے وہ دریافت کا کوئی سادہ عمل نہیں ہے بلکہ کیپٹل ازم کا ایک بہت بڑا آلہ ہے۔ کیپٹل ازم ایک پوری ایمپائر ہے اور ٹیکنو سائنس اس کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ کہتے ہیں کیا وجہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹیکنالوجی میں آگے نہیں جا رہے، حالانکہ فلاں بچے نے فلاں چیز ایجاد کر لی؟ تو، ایجاد کرنا کوئی مسئلہ نہیں، مسئلہ تو Actualize کر کے Mass scale پہ بنانا ہے، اس کے لیے جو لیبز چاہییں، جو انفراسٹرکچر چاہیے، اس پر اربوں ڈالر خرچ آتا ہے، وہ آپ کے پاس نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ اب یہ سائنس کا عمل کوئی خالص ذہنی عمل نہیں ہے، اس کے ساتھ سرمائے کا ایک غیر معمولی بیک اپ ہو گا تو یہ بات پھر آگے بڑھے گی ورنہ نہیں بڑھے گی۔

جاری ہے

*****

مولانا حماد احمد ترک

نائب مدیر ماہنامہ مفاہیم، کراچی

جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

قسط نمبر ۵

۸: بایزید دوم ۱۴۵۰۔۱۵۱۲ء

سلطان محمد فاتح جنھیں زہر دے کر شہید کر دیا گیا تھا، ان کی وفات کی خبر نے قسطنطنیہ میں افراتفری پھیلا دی اور ینی چری کے دستے شہر میں لوٹ مار کرنے لگے۔ سلطان محمد فاتح کے دو بیٹے تھے: شہزادہ بایزید اور شہزادہ جم، اور دونوں ہی مختلف علاقوں میں ذمے داریاں انجام دے رہے تھے۔ جوں ہی بڑے بیٹے بایزید کو سلطان کی وفات کی اطلاع ملی، اس نے دارالخلافہ پہنچ کر حاکمیت کا اعلان کر دیا۔ فوج کے اکثر افسران بایزید کے حامی تھے چنانچہ سب نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی، لیکن بایزید کے بھائی اور سلطان فاتح کے چھوٹے بیٹے شہزادہ جم نے بایزید کو سلطان ماننے سے انکار کر دیا اور تخت سے دست برداری کا مطالبہ کیا۔ بایزید تعلیم و تعلم سے زیادہ شغف رکھتا تھا اور جم فنِ حرب میں ماہر تھا، بایزید نے جم کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔ اس پر شہزادہ جم نے دوسرا مطالبہ کیا کہ سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور دونوں کی حاکمیت الگ الگ خطوں پر تسلیم کی جائے۔ ظاہر ہے کہ بایزید کے لیے یہ مطالبہ ماننا ناممکن تھا، اور سلطنت ٹکڑے کر دینا گویا اپنے آباواجداد کی صدیوں کی محنت پر پانی پھیر دینے کے مترادف تھا۔ جب یہ مطالبہ بھی رد ہوا تو شہزادہ جم نے کچھ لشکر جمع کیا اور بایزید سے جنگ کا اعلان کیا، لیکن جلد ہی شکست کھا کر فرار ہوا اور مصر میں پناہ لی۔ کچھ عرصے بعد دوبارہ عثمانی مقبوضات میں حملے کی غرض سے داخل ہوا لیکن دوبارہ شکست کھائی۔ اس مرتبہ وہ مدد کے لیے روڈس جا پہنچا تا کہ وہاں سے مدد لے کر

سہ بارہ حملہ کرے اور یورپی خطے پر مشتمل عثمانی مقبوضات کو نقصان پہنچائے۔ روڈس کا حاکم ڈی آبوسن انتہائی مکار اور غدار آدمی تھا۔ اس نے ایک طرف تو جم کو مدد کی یقین دہانی کرائی اور دوسری طرف اپنی مکاری کو کام میں لاتے ہوئے بایزید سے معاہدہ کر لیا کہ وہ سالانہ بھاری رقم کے عوض شہزادہ جم کو نظر بند رکھے گا، بدنصیب شہزادہ جم طویل عرصہ اسی طرح قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرتا رہا۔ کبھی روڈس کبھی فرانس اور کبھی روم میں محصور رہا اور مختلف بادشاہ اس کو اپنی تحویل میں رکھ کر سلطنتِ عثمانیہ سے خطیر رقم وصول کرتے رہے۔ ایک موقعے پر تو روڈس کے حاکم نے قاہرہ میں مقیم شہزادہ جم کی والدہ سے بھی اس وعدے پر بھاری رقم وصول کی کہ وہ شہزادے کو بحفاظت قاہرہ پہنچادے گا لیکن یہ بھی دھوکا ثابت ہوا۔ بہر حال، طویل عرصے تک پوپ اور مختلف بادشاہ شہزادہ جم کو ذلت ورسوائی کے ساتھ ادھر ادھر دوڑاتے رہے (اور غیروں سے اسی کی توقع تھی، ان مکاروں سے بھلائی کی امید سلطان فاتح کے بیٹے کو کیونکر ہوئی، تعجب ہے) لیکن جب پوپ اسکندر بورجیا نے شہزادے کو فرانسیسی سپہ سالار سے لے کر فرانس منتقل کیا تو بورجیا نے شہزادے کو قتل کروادیا۔ ۱۴۹۵ء میں عثمانی تخت کا یہ لاچار دعوے دار عین جوانی میں قیدِ حیات وقیدِ افرنگ دونوں سے رہا ہو گیا۔ شہزادے کے قتل سے سلطان بایزید کی حکومت کو قدرے استحکام نصیب ہوا۔

سلطان بایزید دوم حصولِ علم میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے اور کبار علما کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔ زہد وتقوی اور کثرتِ عبادت کے سبب لوگوں نے آپ کو ''ولی'' اور ''صوفی'' کا لقب دیا۔ سلطان بایزید دوم بہت عمدہ شاعر تھے اور ''عدلی'' تخلص کرتے تھے۔ سات سال کی عمر میں اماسیا کے امیر مقرر ہوئے۔ سلطنت کا ابتدائی زمانہ شہزادہ جم سے مقابلے میں گزرا، بعد میں کئی جنگیں ہوئیں لیکن کوئی قابلِ ذکر معرکہ نہیں ہوا بلکہ اوٹرانٹو، جسے سلطان محمد فاتح نے فتح کیا تھا، عدم استحکام کے باعث بایزید کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ ہنگری سے بھی صلح کرلی گئی۔ البتہ وینس میں عثمانی لشکر کو کامیابی نصیب ہوئی۔ اگرچہ وینس، آسٹریا، اسپین اور پوپ کے متحدہ بحری بیڑے نے عثمانی بحری لشکر پر زبردست حملہ کیا لیکن عثمانی لشکر نے تعداد کی کمی کے باوجود انھیں شکست دی۔ اسپین میں اہلِ اسلام پر حالات تنگ کر دیے گئے تھے اور غرناطہ میں عیسائی مظالم سے بے حال مظلوم مسلمان عالمِ اسلام میں ہر طرف خطوط بھیج چکے تھے لیکن کہیں سے انھیں مدد

نہیں مل سکی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت پورا عالمِ اسلام زوال سے دو چار تھا۔ عثمانی بحری بیڑے نے اس موقعے پر اسپین کے مختلف ساحلوں پر در اندازی کی اور متعدّد حملے کیے لیکن خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہو سکا۔

مصری اور عثمانی افواج بھی طویل عرصے تک معرکہ آرائی میں مشغول رہیں اور اس لڑائی کا کوئی انجام نظر نہ آتا تھا کہ اچانک سلطان بایزید دوم نے صلح کا اعلان کیا اور بہت سے قلعے حاکمِ مصر کو دے دیے۔ یوں کچھ عرصے کے لیے یہ جنگ ملتوی ہو گئی۔ سلطان بایزید کی عمر بہت زیادہ ہو گئی تھی اور ضعف اور کثرتِ حِلم کے سبب سلطنت کے بہت سے امور تعطل کا شکار ہو گئے تھے۔ لہذا سلطان نے ارادہ کیا کہ اپنے درمیانے بیٹے شہزادہ احمد کو تخت سونپ دے اور خود گوشہ نشین ہو جائے، لیکن چھوٹے بیٹے شہزادہ سلیم کو یہ بات گوارہ نہ تھی۔ چنانچہ اس نے لشکر کشی کرتے ہوئے قصرِ خلافت کا گھیراؤ کر لیا اور افواج نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ سلطان بایزید نے سپاہیوں کو جنگ سے روک دیا اور یہ پیغام بھیجا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ جواب ملا کہ سلطان ضعیف العمر اور کمزور ہے، ہم سلطان کی برطرفی چاہتے ہیں۔ بایزید نے یہ مطالبہ منظور کیا اور سلیم کی حاکمیت کا اعلان کیا۔ اس واقعے کے کچھ روز بعد ہی ۱۵۱۲ء میں بایزید ثانی کا انتقال ہو گیا۔ بایزید نے بھی اپنے آبا کی پیروی میں مساجد، مدارس، مہمان خانے اور شفاخانے تعمیر کیے، بایزید کو اپنی بنائی ہوئی مسجد بایزید کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

۹: یاووز سلیم ۱۴۷۰۔۱۵۲۰ء

سلطان یاووز سلیم خان جنھیں سلیم اول بھی کہا جاتا ہے عثمانی سلاطین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، کم سنی میں اپنے دادا سلطان محمد فاتح کی تربیت میں رہے اور گھر میں تفسیر، حدیث اور دیگر علوم و فنون کی تحصیل کی۔ بہت جلد عربی و فارسی روانی سے بولنے لگے۔ دادا کی وفات پر بایزید دوم سلطان بنے تو سلیم خان کو طرابزون کا والی مقرر کیا گیا، سلیم خان کو جب محسوس ہوا کہ والد بایزید دوم کی گرفت سلطنت پر کمزور ہو رہی ہے اور کوئی نااہل اس موقعے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو لشکر کے ساتھ قسطنطنیہ پہنچے اور زبردستی اقتدار حاصل کیا۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً بیالیس سال تھی۔ ۱۵۱۲ء میں سلیم خان کی تخت نشینی کا اعلان کیا گیا۔

سلطان سلیم خان اپنی عادات میں دیگر سلاطین سے بہت منفرد تھے۔ دن کا اکثر حصہ مطالعے میں

گزارتے یا علما کی صحبت میں۔ مورخین نے لکھا ہے کہ سلطان سلیم اپنے دادا کی تربیت کے سبب؛ مشہور فاتحین مثلاً سکندرِ اعظم اور سیزر وغیرہ کے حالات دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ بہت کم وقت اپنے حرم میں گزارتے۔ رات کے وقت بھی تاریخ اور فارسی شاعری پڑھتے۔ فارسی میں کچھ نظمیں بھی لکھیں، لیکن اس علم دوستی کے باوجود جنگی امور میں نہایت چست اور محنت کش تھے اور طبیعت میں غصہ بہت زیادہ تھا۔ سلطان سلیم کی سخت مزاجی سے ہر شخص ڈرتا تھا اور اسی سختی اور محنت کشی کے سبب انھیں "یاووز" کا لقب ملا جس کا مطلب ہے "پر عزم اور شدت مزاج"۔ نہیں معلوم یہ سختی انھیں فطرت میں ملی تھی یا والد بایزید کی انتہائی نرمی اور بردباری سے عمائدین سلطنت نے جو ناجائز فائدے اٹھائے اس کا ردعمل تھا۔ یاووز سلیم نے محض آٹھ سال حکومت کی لیکن ان آٹھ سالوں میں تقریباً سات وزیر اعظم اور متعدّد سپہ سالار و عہدے دار سلیم کے غضب کا شکار ہو کر قتل ہوئے۔ لیکن یہی سلیم جو سلطنت کے عہدے داروں کے لیے انتہائی سخت تھا، عوام میں بے انتہا مقبول تھا، کیونکہ وزیر اور دیگر عہدے دار ہمیشہ سلیم اول کے خوف سے عدل وانصاف پر قائم رہتے تھے۔ سلیم نے محض آٹھ سال میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو بہت سے سلاطین کے دہائیوں کے عہد پر بھاری ہیں۔

سلیم خان نے تخت سنبھالا تو اسے اپنے بھائیوں سے بغاوت کا خطرہ ہوا۔ سلیم نے انھیں صلح پر آمادہ کیا اور جان بخشی کی لیکن وہ جنگ کے لیے تیار ہو گئے اور یکے بعد دیگرے دونوں بھائی قتل ہوئے۔ سلیم خان انتہائی متشدد سنی تھا اور اہلِ تشیع سے شدید نفرت کرتا تھا۔ چنانچہ پہلا ہدف سلطان نے ایران کو بنایا۔ ایران پر اس وقت شاہ اسماعیل صفوی حاکم تھا جو انتہائی غالی رافضی تھا۔ اس کے مبلغین اناطولیہ میں شیعیت کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ سلیم اول نے اپنے خاص جاسوسوں کے ذریعے ان رافضیوں کو شمار کروایا اور ایک منظم منصوبے کے تحت اسلام دشمن اور ریاست مخالف ہزاروں رافضیوں کو ایک ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دراصل ان رافضیوں کا ایک طبقہ شاہ اسماعیل کی عقیدت میں بے انتہا آگے بڑھ گیا تھا اور اسلام کی تعلیمات کی صریح توہین کرتا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف زہر اگلنا ان کا مشغلہ تھا۔ بلاشبہ یہ یاووز سلیم کا ایک بڑا کارنامہ تھا، اس واقعے نے شاہ اسماعیل صفوی کے تن بدن میں آگ لگا دی کیونکہ اس کی برسوں کی محنت لمحوں میں ختم ہو گئی تھی۔ اس نے سازشوں میں تیزی دکھانی شروع کر دی۔ عثمانیوں کے خلاف ایک لشکر تیار کیا اور والیٔ مصر (جو کہ

مملوک خاندان سے تھا) کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ والیٔ مصر کی ایک جنگ سلیم اول کے والد بایزید دوم سے ہو چکی تھی اور عثمانیوں سے اس کی مخاصمت پرانی تھی، چنانچہ وہ اِس پر آمادہ ہوا کہ عثمانی لشکر کو کمک سے محروم رکھے گا۔ شاہ اسماعیل صفوی نے ایک کام اور یہ کیا کہ یاووز سلیم کے بھتیجے یعنی شہزادہ احمد کے بیٹے مراد کو اپنے پاس پناہ دی اور اسے تخت کے دعوے دار کے طور پر تیار کرنے لگا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے اسباب نے ایران کے ساتھ جنگ کو ناگزیر بنا دیا۔ یاووز سلیم اپنے لشکر جرار اور توپ خانے کو لے کر دشوار گزار پہاڑی راستہ عبور کرتے ہوئے محض ایک سو چھبیس دنوں میں ہزار میل دور ایران میں داخل ہو گیا، وادیٔ چالدیران میں دونوں افواج کا مقابلہ ہوا۔ اگرچہ ایرانی فوج ترکوں کے مقابلے میں بالکل تازہ دم تھی لیکن عثمانی توپ خانے کے آگے ان کی پیش نہ گئی اور عبرت ناک شکست سے دوچار ہوئی۔ شاہ اسماعیل زخمی ہو کر بھاگ نکلا اور سلطان یاووز سلیم ۴/ستمبر ۱۵۱۴ء کو فاتحانہ شیراز میں داخل ہوئے۔ شاہی خزانے کے علاوہ بے شمار صناع اور ماہرین کو قسطنطنیہ منتقل کیا، لیکن ایران کو سلطنتِ عثمانیہ میں ضم نہیں کیا۔ مغربی مورخین اس کی وجہ شیعیت سے شدید نفرت اور بغض قرار دیتے ہیں۔ بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ یاووز سلیم نے بارہا اہلِ تشیع سے اپنی نفرت کا اظہار کیا، حتیٰ کہ ایران سے تجارت پر مکمل پابندی لگا دی اور چند تاجروں نے ایرانی مصنوعات کی خرید و فروخت کی تو انھیں سزائے موت سنا دی۔ مفتیٔ اعظم نے بمشکل یہ سزا منسوخ کروائی۔ اسی سفر میں یاووز سلیم نے دیار بکر اور ماردین جیسے اہم خطے فتح کیے اور کردستان کو سلطنت میں شامل کیا۔

والیٔ مصر و شام نے ایران کی حمایت میں عثمانیوں کا کافی نقصان کیا تھا، چنانچہ یاووز سلیم نے اگلا ہدف مصر و شام کو مقرر کیا۔ حجازِ مقدس اور فلسطین بھی والیٔ مصر و شام مملوک سلطان قانصوہ غوری کے زیرِ نگیں تھے چنانچہ مصر پر حملے سے قبل یاووز سلیم نے علما اور وزرا کی مجلس منعقد کی اور ان سے مشورہ طلب کیا۔ مجلسِ مشاوت نے بالاتفاق مصر پر لشکر کشی کی اجازت دی اور مفتیٔ اعظم نے حرمین شریفین کی خدمت کا حق دار عثمانی سلطان کو قرار دیا۔ چنانچہ سلطان نے قسطنطنیہ سے فوج کو روانہ کیا اور شام میں داخل ہو کر مملوک فوج سے مقابلہ کیا۔ جلد ہی مملوک فوج کو شکست ہوئی، قانصوہ غوری مارا گیا۔ اس کے بعد سلطان آگے بڑھے تو حلب کے باشندے اپنے علما کی سرپرستی میں یاووز سلیم کے استقبال کے لیے آئے۔ حلب میں سلطان کے نام

کا خطبہ پڑھا گیا اور پہلی مرتبہ سلطان کے نام کے ساتھ خادم الحرمین الشریفین کا لقب استعمال کیا گیا۔ الغرض دمشق، حلب، حمص اور فلسطین ہر جگہ سلطان کا شاندار استقبال ہوا۔ سلطان یاووز سلیم نے بھی ہر جگہ انعام واکرام کی روش اپنائی اور بے پناہ سخاوت کا مظاہرہ کیا۔ فقرا کے لیے لنگر خانے تعمیر کیے۔ اس کے بعد سلطان کا لشکر قاہرہ کی طرف بڑھا۔ پہلا معرکہ غزہ میں ہوا جس میں مملوکوں نے شکست کھائی، اور دوسرا بڑا معرکہ قاہرہ میں ہوا۔ مملوک سردار بندوقوں اور توپوں سے لڑنے کو بزدلی اور خلافِ جرات سمجھتے تھے۔ ان کا موقف تھا کہ یہ نبوی طریقِ جنگ سے موافقت نہیں رکھتا۔ نیزان کے پاس جو توپ خانہ تھا وہ بہت بھاری تھا اور اسے منتقل کرنا آسان نہ تھا۔ عثمانیوں نے اپنے توپ خانے کا بھرپور استعمال کیا اور مملوکوں کو شہر تک محدود کر دیا، لیکن مملوک سپاہی بھی شجاعت کی مثال بن گئے۔ انھوں نے ہر موڑ کو مورچا اور ہر گلی کو قلعہ بنا دیا۔ عثمانی سپاہی جو کہ فتح کے نہایت قریب تھے اور مخالفین کو شہر میں محصور کر چکے تھے، یوں لگتا تھا کہ انھیں اچانک کسی ناقابلِ تسخیر فصیل کا سامنا تھا اور وہ فصیل مملوک سپاہیوں کے سینوں سے کھینچی گئی تھی۔ بہت پس و پیش کے بعد بھی صرف ایک دستہ شہر میں داخل ہو سکا جسے مملوک سپاہیوں نے قتل کر دیا۔ اس موقعے پر سلطان یاووز سلیم نے اعلان کیا کہ اگر ہتھیار ڈال دیے جائیں تو سب کو امان ہو گی۔ اس اعلان کو مملوک سرداروں نے غنیمت جانا اور سلطان کے وعدے کے بھروسے پر اپنے آٹھ سو ممتاز سپاہی یاووز سلیم کے پاس بھیج دیے، لیکن یاووز سلیم نے وعدے کا پاس نہیں کیا اور انھیں قتل کر دیا۔ پھر قاہرہ میں داخل ہو کر قتلِ عام کا حکم دیا اور تقریباً پچاس ہزار افراد قتل کیے گئے۔ مسلمانوں کا یہ قتلِ عام سلیم اول کے زریں عہد پر ایک بدنما داغ ہے جو مٹائے نہیں مٹتا۔ ایک مشہور مملوک سردار قرط بے اس قتلِ عام کے دوران قاہرہ میں روپوش ہو گیا تھا، سلطان نے اسے امان دینے کا اعلان کیا جس پر وہ باہر نکل آیا لیکن اسے بھی سلطان نے قتل کر دیا۔ اپریل ۱۵۱۷ء میں مملوک سردار طومان بے بھی قتل ہو گیا جس کے بعد مملوکوں کی حکومت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔

مصر کی فتح کے بعد سلطان نے مصر و شام کا نظام از سرِ نو ترتیب دیا۔ مکہ کے گورنر کو نذرانہ ارسال کیا اور ایک خط لکھا جس میں ان سے عقیدت کا اظہار کیا۔ انھیں بھاری رقم ہدیہ کی اور اہلِ مکہ و مدینہ کے لیے تحائف بھیجے۔ شریفِ مکہ نے بھی جواباً ایسا ہی خط ارسال کیا اور حجاز میں سلطان یاووز سلیم کی بیعت لی اور اہلِ حجاز سے

عثمانی سلطان کی اطاعت کا اقرار لیا۔ عباسی خلیفہ نے بھی یاووز سلیم کو خلیفۃ المسلمین تسلیم کیا اور بہت سے تحائف ارسال کیے جن میں نبی کریم ﷺ کی تلوار مبارک بھی شامل تھی۔ ستمبر ۱۵۲۰ء میں سلطان یاووز سلیم اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے لیکن آٹھ سال کے عرصے میں سلطنت میں توسیع کے ساتھ ساتھ ایسی اصلاحات کر گئے جو آئندہ سالوں میں سلطنت کے استحکام کا باعث بنیں۔ سلطان کو استنبول میں سلیمیہ مسجد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ یہ مسجد سلطان سلیم ہی کے حکم سے بنائی گئی تھی۔ ایک اہم بات جو عموماً مورخین نے سلطان سلیم کے حالات میں ذکر نہیں کی وہ معمار سنان کی خدمات ہیں۔ معمار سنان متوفی ۱۵۸۸ء عثمانی سلاطین کا سرکاری معمار اور عثمانی طرزِ تعمیر کا ماہر تھا۔ معمار سنان نے بہت طویل عمر پائی۔ کہا جاتا ہے کہ اولاً معمار سنان مذہباً عیسائی تھا اور اناطولیہ کے ایک عیسائی خاندان کا فرد تھا۔ عثمانی افواج میں ملازمت کی اور اسلام قبول کیا۔ سلطان سلیم کے لشکر میں نمایاں کارکردگی پر پیادہ دستے کی قیادت حاصل کی اور فتحِ قاہرہ میں حصہ لیا۔ توپ خانے کا انتظام سنبھالا اور ایران کے خلاف جنگ میں اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ متعدّد مساجد تعمیر کیں۔ عظیم معمار سنان نے پہلی مسجد ''شہزادہ مسجد'' تعمیر کی۔ معمار سنان کی تعمیر کردہ دیگر مساجد میں سلیمیہ مسجد، سلیمانیہ مسجد، مہرماہ مسجد اسکودار اور مہرماہ مسجد ادرنہ کاپے شامل ہیں۔ عثمانی عہد کی بہت سی تعمیراتی یادگاریں معمار سنان کا شاہ کار ہیں یا معمار سنان کے خاص طرزِ تعمیر کا عکس ہیں۔

جاری ہے

کتابیات

السلاطين العثمانيون، راشد كوندوغدو، الناشر: دار الرموز للنشر، إسطنبول، ۲۰۱۸ء

آلبوم پادشاہانِ عثمانی، مترجم: میلاد سلمانی، ناشر: انتشاراتِ قَقْنُوس، استنبول، ۲۰۱۵ء

تاریخِ سلطنتِ عثمانیہ، ڈاکٹر محمد عزیر، ناشر: کتاب میلہ، ۲۰۱۸ء

سلطنتِ عثمانیہ، ڈاکٹر علی محمد الصلابی، مترجم: علامہ محمد ظفر اقبال، ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، جون ۲۰۲۰ء

*****

صوفی جمیل الرحمن عباسی
مدیر ماہنامہ مفاہیم و ناظمِ شعبہ تحقیق و تصنیف، فقہ اکیڈمی

معرکۂ عینِ جالوت اور احیاے خلافت

۲۵ر رمضان ۶۵۸ھ کا ایمان افروز معرکہ، جس میں مسلمانوں کو تاتاریوں پر شاندار فتح حاصل ہوئی

رمضان ۶۵۸ھ/۱۲۶۰ء میں تاتاریوں اور مسلمانوں کے درمیان فلسطین میں نابُلس اور بیسان کے درمیانی علاقے عین جالوت میں ایک تاریخی معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں کو عظیم الشان فتح نصیب ہوئی۔ جس سے مسلمانوں کو حیاتِ جدید اور تنظیمِ نَو کی امنگ نصیب ہوئی ورنہ وہ دنیا سے اپنے مکمل خاتمے کے منتظر تھے۔ اسی فتح کے نتیجے میں، چند سال پیش تر، بغداد میں ختم ہونے والی عباسی خلافت کا مصر میں احیا کر دیا گیا۔ منگولوں کو یہاں ایسی شکستِ فاش ہوئی جس نے ان کے دانت کھٹے کر کے انھیں پسپائی پر مجبور کیا بلکہ ان کے تکبر کو خاک میں ملا دیا۔

عالمِ اسلام کی حالت

ساتویں صدی ہجری میں مسلمانوں کی حکومت؛ چین سے لے کر اندلس تک، دنیا کے تقریباً نصف حصے پر پھیلی ہوئی لیکن عالمِ پیری میں تھی۔ خلافتِ عباسیہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار رہی تھی۔ عباسی حکمران آلِ بُوَیہ کی شیعہ سرپرستی سے نکلنے کے بعد سلجوقیوں کی سنی سرپرستی میں آرام کی زندگی گزار رہے تھے۔ بالفعل ان کی حکومت صرف عراق کے کچھ حصے پر تھی اور باقی ملک خود مختار لیکن باہم متحارب ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔

منگول حملوں کی ابتدا

عالمِ اسلام پر منگولوں کی تاخت و تاراج کی ابتدا، ۶۱۶ھ میں بخارا سے ہوئی۔ اس کے بعد سمرقند،

خراسان، کابل، سلطنتِ خوارزمی اور دیگر علاقوں کو فتح کرتے کرتے آخر کار، ۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء میں، ہلاکو خان اور کتبُغا کی سرکردگی میں بغداد میں داخل ہوئے۔ منگول سالار نے قبضے کے بعد آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ، ان کی اولاد اور مسلمانوں کے امرا و علما کو قتل کرنے کے بعد شہر بغداد میں قتل عام کا حکم دیا۔ ۴۰ دن تک قتل عام جاری رہا۔ بغداد میں کچھ عرصہ رکنے کے بعد تاتاری مزید آگے بڑھے اور اگلے دو سالوں میں فلسطین، شام اور اس کے پایۂ تخت اور مسلمانوں کے سابقہ دار الخلافہ دمشق کو بھی فتح کر چکے تھے۔ دمشق کی فتح کے بعد وہ مصر کی جانب متوجہ ہوئے لیکن اس ملک کو کمزور جانتے ہوئے فوج کشی کی حاجت محسوس نہ کی بلکہ ایک متکبرانہ خط کو کافی سمجھا۔ خلافِ توقع مصریوں کی طرف سے سخت جواب آیا جس نے تاتاریوں کے غیض وغضب کو بھڑکا دیا۔ ہلاکو خان کا خاص کمانڈر کتبُغا (کتبُغانوین) مصر پر حملے کے منصوبے بنانے لگا۔

مصر کی حکومت

مصر پر ان دنوں ممالیک کی حکومت تھی۔ اس کا مختصر پسِ منظر یہ ہے کہ صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ (۵۳۲۔۵۸۹ھ/۱۱۳۷ - ۱۱۹۳ء) کے انتقال کے بعد سلطنتِ ایوبی بکھر کر باہم متحارب علاقائی حکومتوں میں تقسیم ہو گئی۔ ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں مصر پر ایوبی حکمران، الملِک الصالح نجم الدین ایوب (۶۰۳۔۶۴۸ھ/۱۲۰۶۔۱۲۴۹ء) کی حکومت تھی جو سلطان صلاح الدین ایوبی کے بھائی سلطان الملک العادل سیف الدین کے پوتے تھے۔ دوسرے علاقوں کے ایوبی حکمران انھیں ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ حاکمِ دمشق صالح اسماعیل (الملک الصالح کے چچا)، حاکمِ کرک ناصر داؤد اور حاکمِ حمص منصور ابراہیم نے، مصر کے خلاف صلیبیوں کے ساتھ ایک اتحاد قائم کیا۔ معاہدے کی رو سے مصر کے خاتمے کے بعد، بیت المقدس عیسائیوں کو دیا جانا تھا جبکہ مصر ایوبیوں میں تقسیم کیا جانا تھا۔ ۶۴۲ھ میں الملک الصالح نے ریاستِ خوارزم کے زوال کے بعد ماری ماری پھرنے والی خوارزمی فوج کی مدد حاصل کی اور مخالفین کی متحدہ فوج کو شکستِ فاش دے کر شام اور فلسطین کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا لیکن جلد ہی خوارزمی ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اس وقت الملک الصالح نے افواج کی کمی غلام خرید کر پوری کرنے کی کوشش کی۔

ممالیک کا تعارف

اس دور میں غلاموں کی خرید و فروخت عام تھی۔ عام کاموں کے علاوہ غلاموں سے فوجی خدمات لینا پرانا طریقہ چلا آتا تھا۔ لیکن الملک الصالح نجم الدین ایوب نے فوجی خدمت کے پیشِ نظر اس طریقے کو باقاعدہ ایک فن کی شکل دے ڈالی اور وہ کثرت سے غلام خریدنے لگے۔ انھوں نے اپنے ساحلی محل کے سامنے اپنے ممالیک کے لیے قلعہ بنوایا۔ یہاں ان غلاموں کو لغتِ عرب، شعر و ادب، قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم کے بعد فنونِ حرب و ضرب سکھائے جاتے۔ ملک الصالح ان کے کھانے پینے کی خود نگرانی کرتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے میں شریک ہوتے۔ ان ممالیک کو الملک الصالح کی نسبت سے الصالحیہ اور ساحل کی نسبت سے البحریہ کہتے تھے۔ جلد ہی یہ لوگ فوج میں اہم خدمات انجام دینے لگے۔ یہ طبقہ ممالیک الصالحیہ البحریہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

مصر اور مملوک حکومت

شعبان ۶۴۷ھ میں الملک الصالح نجم الدین ایوب نے بیمار ہو کر انتقال کیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے توران شاہ نے حکومت سنبھالی۔ لیکن جلد ہی توران شاہ اور ان کی سوتیلی ماں ملکہ شجرۃ الدر میں اختلافات ہو گئے۔ توران شاہ کے قتل کے بعد ملکہ شجرۃ الدر نے ایک مملوک عزالدین ایبک الترکمانی سے شادی کر کے انھیں اَلمَلِكُ الْمُعِزُّ کے لقب سے بادشاہ بنوا دیا۔ مصر میں یہ پہلے مملوک بادشاہ تھے۔ انھوں نے ممالیک کی خرید و تربیت کے سلسلے کو جاری رکھا۔ ان کے مملوک الممالیک الْمُعِزِّيَه کے نام سے مشہور ہوئے۔ عز الدین ایبک کے انتقال کے بعد، ان کے پندرہ سالہ بیٹے نور الدین کو الممالیک المعزیہ کے سینیر کمانڈر سیف الدین قطز کی سرپرستی میں حکمران بنایا گیا۔ یہ وہ عرصہ تھا جس میں اسقاطِ بغداد کے بعد تاتاری شام اور فلسطین وغیرہ کو روندے جا رہے تھے۔ اس وقت اہلِ مصر کو اپنی باری آنے کا خطرہ محسوس ہوا۔ ان حالات میں یہ خیال عام پھیل گیا کہ تخت پر پندرہ سالہ لڑکے کا بیٹھنا مناسب نہیں ہے بلکہ کسی بڑے کو حکمران بنانا ضروری ہے چنانچہ قرعۂ فال سیف الدین قُطز کے نام نکلا۔

سیف الدین قطز کا تعارف

سیف الدین قطز کا اصلی نام محمود بن ممدود تھا۔ یہ جلال الدین خوارزم شاہ کے بھانجے تھے۔ جی ہاں وہی جلال الدین جو دو مرتبہ تاتاریوں کو شکست دینے بعد شکست کھا کر پہلے ہندوستان اور وہاں سے ایران وغیرہ کی طرف نکل گئے تھے۔ شاہِ خوارزم کے خاندان کے کافی سارے لوگ قیدی بنا کر دمشق میں بیچ دیے گئے تھے۔ محمود بن ممدود بھی انھی میں تھے جنھیں ایوبیوں نے خرید لیا۔ ایوبی تعلیم و تربیت نے اس خوارزم شاہی بچے کو مثالی بنا دیا۔ بعد میں کرتے کراتے یہ ملک المعز عزالدین ایبک کے غلام بنے اور بالاخر الملک المظفر کے لقب سے مصر کے تخت پر جلوہ افروز ہوئے۔

مصر کی سیاسی و معاشی حالت

جب سیف الدین قطز کو بادشاہ بنایا گیا۔ اس وقت مصر برے حالوں میں تھا۔ پڑوسی مسلمان ملکوں سے دشمنی جاری اور تعلقات منقطع تھے۔ شامیوں کے ساتھ دو جنگیں بھی ہو چکی تھیں۔ جنگ و جدال کے سبب خزانہ خالی اور ملک معاشی بدحالی کا شکار تھا۔ سیاسی استحکام نام کو نہ تھا۔ دس سال میں چار حکمران تبدیل ہو چکے تھے۔ الممالیک الصالحیہ اور المالک المعزیہ کی آپس میں رنجش عروج پر تھی چنانچہ ممالیک صالحیہ میں سے کئی ایک مصر چھوڑ کر شام جا آباد ہوئے تھے۔

الملک المظفر کے نیک عزائم

جس دن سیف الدین قطز کو حکمران تسلیم کیا گیا، انھوں نے امرا، علما اور اصحابِ رائے کے سامنے اپنا اعلامیہ ان الفاظ میں جاری کیا: ”میں حکومت کے مزے لینے کے لیے تخت پر نہیں بیٹھا بلکہ کافروں کے خلاف جہاد کے لیے میں نے کرسی سنبھالی ہے اس لیے کہ حکومت کے بغیر یہ ممکن نہ تھا اور کم سن بادشاہ نور الدین کے لیے یہ کام مشکل تھا۔ جب ہم دشمن کو شکست دے لیں گے تو پھر حکومت کا معاملہ تمھارے ہاتھ میں ہوگا، تم جسے چاہو اسے کرسیٔ اقتدار پر بٹھا دینا۔ اس لیے کہ کسی خاص خاندان یا گروہِ ممالیک کو حقِ

حکومت حاصل نہیں ہے اور نہ ہی یہ حق وراثت میں منتقل ہو گا"۔ یہ اعلامیہ روحِ اسلام کے عین مطابق تھا جس سے قطز کی مقبولیت میں بہت اضافہ ہوا۔

اصلاحی اقدامات

سیف الدین قطز نے دورانِ قید تاتاریوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی جنگی چالوں، مکاریوں اور ذہنیت سے وہ خوب واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تاتاری جلد ہی مصر کا رخ کریں گے۔ چنانچہ وقت ضائع کیے بغیر ان کے مقابلے کی تیاری مکمل کرنی چاہیے۔

داخلی اتحاد و اتفاق

سیف الدین قطز جانتے تھے کہ اتحاد کے بغیر مسلمان فلاح نہیں پا سکتے۔ اگرچہ وہ خود المالیک المعزیہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن انھوں نے ممالیک الصالحیہ کے ساتھ اپنے اختلافات ختم کرتے ہوئے ان کے لیے عام معافی کا اعلان کیا۔ انھوں نے قریبی ریاستوں میں جا آباد ہونے والے مملوک سرداروں کو مصر واپسی کا پیغام دیا۔ چنانچہ ادھر ادھر سے لوگ واپس آنے لگے۔ ان میں ماہر ترین مملوک کمانڈر رکن الدین بیبرس بھی تھے۔ سیف الدین قطز نے ان لوگوں کا استقبال بہت عمدگی سے کیا۔ جس سے شکر رنجی دور ہوئی اور دوستانہ تعلقات قائم ہونے لگے۔ فوجوں کا سالار فارس الدین أَقطَائی الصغیر کو بنایا جو اگرچہ ان کے سابقہ مخالف گروہ ممالیک سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنی لیاقت کی بنیاد پر اس منصب کے لائق سمجھے گئے۔ اس اقدام نے مملوکوں کی رہی سہی تشویش بھی ختم ہو گئی۔ داخلی استحکام کے لیے انھوں نے ریاست کے نااہل وزیر کو معزول کر کے زین الدین یعقوب کو وزیر مقرر کیا۔

خارجی اتحاد و اتفاق

سیف الدین قطز نے پڑوسی مسلمان ریاستوں کے ساتھ اتحاد کی کوششیں بھی شروع کر دیں۔ شام کے ساتھ مصر کی لڑائیاں ہو چکی تھیں۔ وہاں ایوبی خاندان کے ملک الناصر حاکم تھے جو ممالیک کو ناپسند کرتے

تھے۔ بلکہ مصر کے خلاف تاتاریوں سے مدد مانگنے کی کوشش بھی کر چکے تھے۔ لیکن سیف الدین قطز نے ان کی خدمت میں ادب واحترام کے ساتھ ایک خط تحریر کیا جس میں تاتاری خطرے کے پیشِ نظر انھیں شام اور مصر کے اتحاد اور متحدہ مملکت کی بادشاہت کی پیش کش کی اور لکھا کہ بادشاہ آپ ہوں گے اور میں مصر میں آپ کا نمائندہ ہوں گا۔ اگر آپ تشریف لائیں گے تو میں فی الفور کرسی ٔحکومت آپ کے لیے خالی کر کے آپ کی خدمت کروں گا۔ اگر آپ کو یہ پیش کش قبول نہ ہو تو میں اپنی فوجوں کو آپ کی سرکردگی میں دینے کو تیار ہوں تاکہ آپ دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ ملک الناصر نے احمقانہ طور پر یہ پیش کش ٹھکرا دی۔ چنانچہ دشمن کے حملے کی اطلاع ملی تو شہریوں کو تاتاریوں کے رحم وکرم پر چھوڑتے ہوئے فلسطین کی طرف فرار ہوا۔ اس موقعے پر اس کی فوج کے ایک بڑے حصے نے اس سے بغاوت کرتے ہوئے غیرت مند بادشاہ سیف الدین قطز کے پاس جانے کو ترجیح دی۔ اس سے سیف الدین قطز کی فوجی قوت میں بہت اضافہ ہوا۔ سیف الدین قطز نے دوسری قریبی ریاستوں کو بھی اتحاد وامداد کی دعوت پر مبنی خط لکھے۔ ان میں سے حماہ کے حاکم امیر منصور نے آپ کی دعوت کو قبول کیا اور بہ نفسِ نفیس اپنی فوج کے ایک حصے کو لے کر مصر تشریف لے آئے۔ سیف الدین قطز نے تاتاریوں سے شکست کھا کر منتشر ہو جانے والے فوجیوں کو پناہ دینے کا اعلان کیا، چنانچہ حلب، دمشق اور فلسطین وغیرہ کے بہت سارے فوجی مصر میں آکر آپ کی فوج میں شامل ہو گئے۔

تاتاریوں کی طرف سے دھمکی آمیز خط

سیف الدین قطز ذو القعدۃ ۶۵۷ھ میں حکمران بنائے گئے تھے۔ چند ماہ بعد ہی یعنی اگلے سال صفر یا ربیع الاول میں انھیں منگولوں کی طرف سے شدید اہانت اور خوفناک دھمکیوں پر مشتمل خط موصول ہوا۔ تاتاریوں کی طرف سے دھمکی آمیز اور مبنی بر حقارت خط ملنے کے بعد قطز نے امرا اور کمانڈروں کا ایک مشاورتی اجلاس بلایا۔ تاتاریوں نے غیر مشروط طور پر ملک حوالے کرنے یا جنگ کی تیاری کا اعلان کیا تھا۔ الحمد للہ کسی امیر نے ملک تاتاریوں کے حوالے کرنے کی رائے تو نہ دی لیکن تمام تر دینی غیرت اور ملی حمیت کے باوجود اکثر امرا تاتاریوں پر حملہ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کی رائے تھی کہ ہم تیاری کر کے مصر ہی

میں بیٹھے رہیں، اگر تاتاری حملہ کریں تو ہم ان کا مدافعانہ مقابلہ کریں۔ ذہن میں رکھیے کہ یہ وہ دن تھے کہ مقولہ مشہور تھا: ”اگر تم سے کوئی کہے کہ تاتاری شکست کھا گئے ہیں تو اس خبر کی تصدیق نہ کرنا“۔ سیف الدین قطز جانتے تھے کہ اب تک تمام مسلمان ریاستوں نے تاتاریوں کے خلاف دفاعی جہاد کیا تھا۔ یعنی وہ اپنے علاقوں میں مقیم رہ کر اپنی باری کا انتظار کرتے اور تاتاریوں کے حملے کے وقت دفاع کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن ان میں سے کوئی کامیاب نہیں ہوا۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ مسلمان عام طور پر خوفزدہ ہیں اور ان کے حوصلے پست ہیں چنانچہ انھوں نے مصر کی حدود سے باہر نکل کر تاتاریوں پر حملہ کرنے کی رائے کا اظہار کیا۔ اس فیصلے کا ایک دینی رخ بھی تھا کہ فلسطین دشمن کے حملے کی لپیٹ میں تھا اور وہاں مدافعت کی طاقت نہ ہونے کے سبب قریبی علاقوں پر بھی جہاد فرض ہو چلا تھا۔ تو اب جب مصری تاتاریوں کی طرف پیش قدمی کرتے تو اس میں صرف مصر کا دفاع نہیں بلکہ ایک شرعی فریضے کی ادائی بھی شامل ہوتی جو یقیناً اللہ کی مدد کو اپنے جانب متوجہ کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہوتا۔ قطز کی اس رائے میں رکن الدین بیبرس آپ کے حامی تھے۔ سیف الدین قطز نے جب دیکھا کہ ان کے امرا پیش قدمی کے بارے میں پس و پیش سے کام لے رہتے تھے۔ تو انھوں نے امرا کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: يا أُمَراءَ المسلمين! لكم زمانٌ تأكلونَ أموالَ بيتِ المال وأنتم لِلغزاةِ كارهينَ وأنا مُتوَجِّهٌ إلى طاعة الله ورسوله والذَّبِّ عن عباد الله، فمن اختار منكم الجهادَ يَصْحَبْني ومن لم يختَرْ ذلك يرجِعْ إلى بيته، فإن الله مُطَّلِعٌ عليه وخطيئةُ حريمِ المسلمين في رقابِ المتأَخِّرين. ”اے امرائے مسلمین! تم ایک زمانہ بیت المال سے کھاتے رہے ہو، اب جب کہ جہاد کا وقت آیا ہے تو اس سے جان چھڑا رہے ہو۔ میں نے تو اپنا رخ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور مسلمانوں کی مدافعت کی جانب سیدھا کر لیا ہے۔ تم میں سے جو بھی جہاد کو اختیار کرتا ہے وہ میرے ساتھ چلے اور جو جہاد کو اختیار نہیں کرتا وہ اپنے گھر لوٹ جائے۔ بے شک اللہ اس سے باخبر ہے۔ اور یاد رکھو مسلمانوں کی پامالی حرمت کا وبال جہاد سے پیچھے رہنے والوں کی گردنوں پر ہو گا“۔ یہ کہتے ہوئے سیف الدین قطز شدّتِ جذبات سے رونے لگے اور امرا کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگے: يا أُمراءَ

المسلمين! مَنْ لِلْإِسلامِ إن لَمْ نكُنْ نَحْنُ. ”اے مسلمان سردارو! اسلام کا اور کون حمایتی بنے گا اگر ہم نہ بنے تو؟“۔ یہ ایسے جادو اثر کلمات تھے کہ امرا کی چیخیں نکل گئیں۔ ”ہم ہر قیمت پر تاتاریوں کا رستہ روکیں گے“ ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ کئی ایک امرا نے سیف الدین قطز کی حمایت میں تقریریں کیں اور آخر کار تمام امرا منگولوں کے خلاف اقدامی جہاد کرنے پر متفق ہوگئے۔ سیف الدین قطز کے تاتاریوں سے جنگ پر مصر اور فتح کے حوالے سے پر امید ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ انھوں نے بہت پہلے خواب میں رسول اللہ ﷺ کی زیارت کی تھی اور ان سے مصر کی حکومت اور تاتاریوں کی شکست کی بشارت پائی تھی۔ علامہ ابنِ کثیر نے اپنی تاریخ میں قطز کا یہ بیان نقل کیا ہے: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ فِي الْمَنَامِ وَقَالَ لِي أَنْتَ تَمْلِكُ الدِّيَارَ الْمِصْرِيَّةَ وَتَكسِرُ التَّتَارَ. ”میں نے رسول اللہ ﷺ کو خواب میں دیکھا تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: تم ملک مصر کے بادشاہ بنوگے اور تاتاریوں کا زور توڑو گے“۔

سفیروں کا قتل

یہاں قطز نے رکن الدین بیبرس کی رائے کے مطابق ایک عجیب فیصلہ کیا اور منگولوں کے چاروں سفیروں کو قتل کر کے ان کے سر قاہرہ میں نمایاں مقامات پر لٹکا دینے کا حکم دیا۔ اگرچہ یہ فیصلہ شریعت کی تعلیمات کے خلاف تھا لیکن دکتور علی محمد الصلابی کی توجیہ کے مطابق، قطز نے انھیں عام دشمن سمجھنے کے بجائے فساد فی الارض کا مرتکب قرار دیا جیسا کہ وہ امان دینے کے باوجود مسلمانوں کے بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرتے رہے۔ یا شاید وہ مسلمانوں پر کافروں کے طاری رعب کو دور کرنا چاہتے تھے یا عوام پر اپنی بے جگری ظاہر کرنا چاہتے تھے، یا بغداد میں مسلمانوں کے قتلِ عام اور اس میں ہر طرح سے انسانی قوانین کی خلاف ورزی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ اس قدام سے تاتاریوں کے ساتھ صلح کے کسی خیال کے امکان کا بھی سدباب کر دینا چاہتے تھے تاکہ امرا اور افواج مقابلہ کرنے کے لیے یکسو ہو جائیں۔ بہرحال کسی بھی وجہ سے یہ غیر شرعی اقدام ایک نیک مسلمان بادشاہ سے سرزد ہوا۔

جنگی تیاری اور مالی مشکلات

لشکر کی تیاری، قلعوں کی مرمت اور سامانِ حرب وضرب کے لیے رقم کی ضرورت تھی جس سے خزانہ تہی دست تھا۔ سیف الدین قطز نے امرا اور علما و فقہا کا ایک اجلاس بلا کر ان کے سامنے یہ صورتِ حال رکھی۔ وہ عوام سے ٹیکس وصول کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے علما و فقہا کا فتوی ضروری تھا۔ اس وقت شیخ الاسلام عز بن عبد السلام رحمہ اللہ مصر میں مقیم تھے۔ آپ نے ایک عظیم الشان فتوی تحریر فرمایا جس میں انھوں نے سب سے پہلے موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر جہاد کو فرضِ عین قرار دیا۔ عوام سے ٹیکس لینے کو انھوں نے دو شرطوں کے ساتھ جائز قرار دیا: پہلی تو یہ کہ خزانے میں بالکل رقم باقی نہ رہے تب عوام سے اتنا ہی ٹیکس لیا جا سکتا ہے جو لشکر کی تیاری کے لیے کافی ہو، اس سے اضافی لینا جائز نہ ہو گا۔ دوسری یہ کہ عوام سے ٹیکس اسی وقت لیا جا سکتا ہے جب کماندار اور افسران اپنا سامانِ تعیش اور آلاتِ فاخرہ بیچ کر جہاد میں لگا چکے ہوں''۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک جُرأت مندانہ اور انقلابی فتوی تھا جسے سیف الدین قطز نے بھی پوری طرح تسلیم کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے اپنے آلاتِ فاخرہ فروخت کے لیے پیش کیے۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے امرا اور وزرا نے بھی اپنا سامان فروخت کو پیش کر دیا۔ بعض امرا سے کسی ریاست کے برابر سامان نکلتا گیا اور یہ حقیقت سب پر آشکار ہو گئی کہ مصر غریب نہیں ہے بلکہ اس کے پیسے پر ایک گروہِ قلیل کا قبضہ ہے۔ چنانچہ فوج کی تیاری کا سامان انھی پیسوں سے تیار ہو گیا اور عوام پر ٹیکس لگانے کی ضرورت نہ رہی۔ اس اقدام سے عوام الناس میں حکومت اور فوج کی خوب پذیرائی ہوئی اور لوگ جوق در جوق فوج میں شامل ہونے لگے۔ جگہ جگہ فوجی مشقیں شروع ہو گئیں۔ قاہرہ کے باہر ایک فوجی کیمپ بنایا گیا اور اِدھر اُدھر سے فوجی دستے وہاں پہنچنے لگے۔

فرضیتِ جہاد کا اعلان

کفار سے جہاد کے متفقہ فیصلے کے بعد قاہرہ اور پورے مصر میں جہاد کی منادی کرائی گئی، جگہ جگہ '' نکلو جہادِ فی سبیلِ اللہ اور نصرتِ دینِ رسول اللہ کے لیے'' کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ حضرت شیخ الاسلام عز بن

عبد السلام رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے علمائے کِرام منبروں سے فرضیتِ جہاد بیان کرنے لگے۔ وہ عوام کو دنیا سے زہد اور جنت سے رغبت کی تعلیم دیتے اور شہادت کا اجر و ثواب بیان کر کے انھیں جہاد پر نکلنے کے لیے تیار کرتے۔ حضرت خالد بن ولید، عمرو بن قعقاع، زبیر بن عوام رضی اللہ عنہم، طارق بن زیاد، موسیٰ بن نصیر، یوسف بن تاشفین، نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی رحمہم اللہ اجمعین کے قصے عام بیان ہونے لگے۔ غزوۂ بدر، غزوۂ احزاب، فتحِ مکہ، جنگِ یرموک، جنگِ قادسیہ، معرکۂ حطین، معرکۂ منصورہ اور معرکۂ فارسکور کے حالات زبان زدِ عام ہو گئے۔ ان نیک کوششوں سے پورے مصر میں جہادی جذبہ بیدار ہو گیا۔ ۶۵۸ھ کے ماہ ربیع الاول سے لے کر ماہ رجب تک جہاد کی تیاری زور و شور سے جاری رہی۔

مصر سے خروج

الملک المظفر سیف الدین قطز رحمہ اللہ ماہِ شعبان ۶۵۸ھ بہ مطابق جولائی ۱۲۶۰ء میں اپنی فوجوں کو لے کر مصر سے نکلے۔ وہ صحرائے سینا عبور کر کے حدود فلسطین میں داخل ہو کر غزہ کے بالکل نزدیک جا پہنچے۔ یہاں الملک المظفر نے اپنی فوجوں سے خطاب کیا: ”اے گروہِ مسلماناں! مسلم بستیوں پر گزرنے والے قتل و غارت گری، آتش و آہنگ اور قید و بند کی داستانیں تم نے سن رکھی ہیں۔ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کہ جو مال و اولاد نہ رکھتا ہو۔ تم جانتے ہو تاتاری شام میں اپنے پنجے گاڑ چکے ہیں جنھوں نے دینِ اسلام کی چولیں ہلا دی ہیں۔ مجھے دینی غیرت و حمیت نے دینِ اسلام کی خدمت و مدافعت پر ابھارا ہے۔ اے بندگانِ خدا! تم پر واجب ہے کہ جہاد کے لیے اس طرح کھڑے ہو جاؤ جیسا کہ اس کا حق ہے۔ میں بھی تم ہی میں سے ایک عام فرد ہوں۔ میں بھی اور تم بھی اپنے اس رب کے سامنے کھڑے ہیں جو سوتا تک نہیں۔ جسے کوئی ٹالنے والا ٹال نہیں سکتا اور جس سے کوئی بھاگنے والا بھاگ نہیں سکتا۔ پس اے میری قوم! سچی نیتوں کے ساتھ اللہ کے لیے جنگ کرو۔ تمھاری یہ سوداگری تمھیں خوب نفع دے گی“۔ اس پر تمام لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور ایک دوسرے کو حلف دینے لگے کہ جب تک ظلم کے یہ اندھیرے دور نہ کر لیں گے چین سے نہ بیٹھیں گے۔ یہاں سیف الدین قطز نے اپنی فوج کے مقدمے پر نامور کمانڈر رکن الدین بیبرس کو متعیّن کیا اور

انھیں غزہ کے علاقے میں قدرے آگے بھیج کر باقی لشکر کو مقدمے سے کافی فاصلے پر رکھا تاکہ دیکھنے میں مقدمہ ہی پورا لشکر معلوم ہو۔ اس میں مخالف فوج یا اس کے جاسوسوں کو اندھیرے میں رکھنا مقصود تھا۔

غزہ میں تاتاریوں کا ایک لشکر مسلمانوں کو نظر آیا۔ رکن الدین بیبرس کی قیادت میں مصری فوج کے مقدمے سے ان کا ٹکراؤ ہوا جس میں تاتاریوں نے کچھ نقصان اٹھا کر راہ فرار اختیار کی۔ اس فتح کی خبر سے مصری فوجوں اور فلسطین کے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ اس معرکے کے بعد بیبرس واپس بقیہ لشکر سے جا ملے۔ تاتاریوں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے بعد مسلمان لشکر یہاں سے شمال کی جانب روانہ ہوا اور بحرِ ابیض کے کنارے کنارے چل کر، یافا اور حیفا سے ہوتے ہوئے عکا کے بالکل نزدیک پہنچا اور کچھ دن کے لیے یہاں ڈیرے ڈال لیے۔

صلیبیوں کے ساتھ سفارت کاری

مسلمانوں کا یہ شہر ڈیڑھ سو سال سے صلیبیوں کے قبضے میں تھا جن کے ساتھ ان دنوں مسلمانوں کی صلح چل رہی تھی۔ سیف الدین قطز کو یہاں کے صلیبیوں کی طرف سے خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں یہ تاتاریوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں نہ کود پڑیں۔ اسی خطرے کے سدباب کے لیے وہ یہاں پہنچے تھے۔ سیف الدین نے مسلمان امرا کا ایک وفد عکا کے صلیبی امرا کے پاس بھیجا جس کے بعد دو طرفہ وفود اور ضیافت اور تحائف کا تبادلہ ہوا۔ صلیبیوں نے اس جنگ میں مسلمانوں کو اپنی مدد کی پیش کش بھی کی۔ قطز نے کہا کہ ہمیں آپ کی مدد کی حاجت تو نہیں ہے لیکن ہم آپ سے غیر جانبداری کی توقع رکھتے ہیں۔ صلیبیوں نے غیر جانبدار رہنے کی یقین دہانی کرائی اور سابقہ معاہدات پر دونوں طرف سے اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ مسلمان وفد نے عکا کی حالتِ زار کو دیکھ کر اطمینان کا اظہار کیا کہ اس وقت صلیبی اگر مسلمانوں کے خلاف ہونا بھی چاہیں تو ان کے حالات اس قابل نہیں ہیں بلکہ بعض امرا نے قطز کو مشورہ دیا کہ اگر ہم عکا پر حملہ کر دیں تو آسانی اپنا مقبوضہ شہر آزاد کرا سکتے ہیں۔ لیکن سیف الدین نے صاف کہا کہ ہم معاہدہ شکنی نہیں کریں گے"۔

عینِ جالوت میں نزول

عکا کے عیسائیوں کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد قطزاپنے لشکر کو لے کر چلے اور عینِ جالوت کے مقام پر ڈیرے ڈال دیے۔ یہ ایک وسیع میدان تھا۔ جو تین اطراف سے ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا جب کہ ایک یعنی شمالی سمت اس کی بالکل کسی صحن کی طرح کھلی ہوئی۔ اطراف کے ٹیلوں پر جھاڑیاں اور درخت بھی موجود تھے۔ سیف الدین قطز نے ان درختوں کو کمین گاہ کے طور استعمال کرنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے مقدمۃ الجیش کو میدان کی شمالی سمت میں ٹھہرایا اور بقیہ فوج کو کمین گاہوں میں چھپا دیا۔ فلسطینی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد میدان میں آموجود ہوئی۔ یہ سیف الدین قطز اور اس کی افواج کے خلوص و اخلاص اور عزم و ارادے کی برکت تھی کہ خواب غفلت میں ڈوبی قوم بیدار و ہشیار ہو گئی ۔ یہ لوگ کوئی ماہر فوجی نہ تھے لہذا انھیں فوجیوں کی خدمت جیسے کام سونپے گئے۔ ان میں ایک بڑی تعداد بوڑھوں بچوں اور عورتوں کی بھی تھی جو مسلمانوں کا حوصلہ بڑھانے آئے تھے۔ یہ ۲۴ اور ۲۵ کی درمیانی رات تھی۔ جو آخری عشرے کی طاق رات ہونے کی وجہ سے امکانی طور پر لیلۃ القدر بھی تھی۔ اس رات چشمِ فلک نے وہ نظارہ دیکھا جو دورِ صحابہ میں وہ دیکھا کرتی تھی کہ مسلمان امرا اور عام لشکری عبادت اور دعا و مناجات میں رات بھر مشغول رہے۔

معرکے کا دن

اگلے دن ۲۵ رمضان کو تاتاریوں کا لشکر شمالی سمت سے میدان میں داخل ہو کر مسلمانوں کے سامنے صف آرا ہوا۔ نمازِ فجر سے فارغ ہونے کے بعد طے شدہ ترتیب کے مطابق مسلمانوں کے مقدمے نے صف بندی شروع کی۔ اس مقدمے کو بہت سارے دستوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ہر ایک دستہ الگ رنگ کا جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا اور اپنی باری پر صف میں داخل ہوتا تھا۔ جس سے تاتاری یہ سمجھے کہ مسلمانوں کا لشکر بہت ساری حکومتوں یا علاقوں کی فوجوں پر مشتمل ہے۔ جب سارا مقدمہ میدان میں اتر چکا تو تاتاری اسے پورا لشکر سمجھ بیٹھے اس لیے کہ غزہ کے معرکے میں بھی ان کا ٹاکرا اتنے ہی لشکر سے ہوا تھا۔ جب صف بندی مکمل ہو گئی تو قلیل لشکر دیکھ کر منگول حسبِ عادت چیختے چلاتے ہوئے بہت زور سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے۔ بیبرس

اور ان کے فوجیوں نے بہت سکون کے ساتھ جم کر ان کا مقابلہ کیا اور بالکل خوف زدہ نہ ہوئے۔ جنگ کا نظارا کرنے والے فلسطینی عوام تکبیر کے نعروں کے ساتھ، اللہ کی جناب میں مجاہدین کے ثبات اور ان کی حفاظت و نصرت کے لیے بلند آواز میں دعائیں کیا جا رہے تھے۔ مجاہدین کے نعروں سے میدان گونج رہا تھا۔ مسلمانوں کو ثابت قدم دیکھ کر تاتاریوں نے مزید فوج میدانِ جنگ میں اتار کر زور کے حملے شروع کیے اور گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ اب منصوبے کے مطابق رکن الدین بیبرس نے منظم انداز میں پسپائی اختیار کرنا شروع کی۔ تاتاری اپنی قوت کے گھمنڈ اور گزشتہ شکست کا بدلہ لینے کے عزم سے اس قدر سرشار تھے کہ انھیں اس کا اندازہ ہی نہیں ہوا کہ یہ مسلمانوں کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔ پس وہ آگے بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے اور مسلمان دفاعی انداز کی جنگ کرتے ہوئے منظم انداز میں پسپا ہوتے رہے یہاں تک کہ تاتاریوں کا پورا لشکر دور اندر تک میدان میں داخل ہو گیا۔ اب سیف الدین قطز نے اپنی بقیہ فوج کو میدان میں داخل کیا جس نے تاتاریوں کو گھیرے میں لینے کی کوشش کی۔ لیکن تاتاریوں کی طرف سے خوفناک جنگ جاری رہی یہاں تک کہ ایک موقعے پر مسلمانوں کا میسرہ ان کے دباؤ میں آ گیا اور اس کی صفیں ٹوٹنے لگیں۔ یہ لڑائی کا فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ جہاں مجاہد اسلام سیف الدین قطز نے اپنا خود اتار کر زمیں پر پٹخا اور تین دفعہ وَا إسلاماہ" ہائے اسلام مٹ گیا" کی آواز بلند کی اور پھر میدان میں کود پڑے۔ وہ باآواز بلند یہ دعا کر رہے تھے: "اے اللہ! ان تاتاریوں کے خلاف اپنے بندے قطز کی مدد فرما"۔ بادشاہ کو اس شان سے میدان میں کودتے دیکھ کر مسلمان فوجیوں کی پامردی میں ڈھیروں اضافہ ہوا اور وہ جم کر لڑنے لگے۔ ایک موقعے پر قطز کا گھوڑا ہلاک ہو گیا تو نیا گھوڑے آنے تک وہ پاپیادہ لڑتے رہے۔ رکن الدین بیبرس، فارس الدین اَقطائی الصغیر اور ملک المنصور نے اپنے بادشاہ کے ساتھ مل کر عظیم لڑائی کی۔ آخر کار تاتاریوں کا زور ٹوٹ گیا اور ان کی صفیں بکھرنے لگیں اور لشکرِ کفار پوری طرح گھیرے میں آ گیا۔ اب مسلمان انھیں چن چن کر قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمان منگول کمانڈر کتبغا کو گھیرنے میں کامیاب رہے اور اسے اس کے بیٹوں سمیت واصل جہنم کر دیا۔ (ایک روایت کے مطابق کتبغا کو قید کر کے بعد میں قتل کیا گیا۔ واللہ

اعلم) منگولوں کا تقریباً آدھا لشکر قتل کیا گیا اور بہت سارے قیدی بنائے گئے۔ اور بہت سارے جان بچا کر میدان سے بھاگنے میں بھی کامیاب رہے۔ الملک المظفر سیف الدین قطز، جب پوری طرح ظفر مند ہو چکے تو سجدہ شکر بجالائے، اپنے گال زمین پر رگڑے اور اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کی۔

فتح کے بعد

مسلمان سپاہی مالِ غنیمت اور زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے تو سلطان نے قیدیوں کا معائنہ کیا۔ قیدیوں میں تاتاریوں کا حلیف، مسلمانوں کا غدار اور سلطان صلاح الدین کے بھائی الملک العادل کا پوتا الملک السعید حسن ابن العزیز بھی تھا۔ جسے سیف الدین قطز کے حکم سے قتل کیا گیا۔ فتح کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ مسلمان عوام جگہ جگہ اٹھ کھڑے ہوئے اور تاتاریوں اور صلیبیوں کو قتل کرنے لگے، بعض جگہ عوام نے تاتاریوں کے حلیف مسلمانوں کو قتل کر کے ان کی منافقت کی سزا دی۔ فتح کے بعد دمشق والوں کو فتح کی بشارت پر مبنی خط لکھ کر مسلمانوں کی فتح اور تاتاریوں کی ہزیمت کی خبر سنائی گئی۔ یہ خبر سن کر یہاں کے سوئے ہوئے مسلمان جاگ اٹھے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کو تاتاریوں کو قتل کرنے لگے۔ تاتاری جان بچانے کے لیے منہ چھپا کر بھاگ رہے تھے اور بعض موت سے بچنے کے لیے ہتھیار پھینک کر قیدی بننا منظور کرتے۔ تاتاریوں کے قبضے کے دوران دمشق کے عیسائیوں نے مسلمانوں پر بہت ظلم کیے تھے۔ لہذا مسلمان عوام نے ان کی اچھی طرح خبر لی اور کئی ایک کو قتل کیا۔ ۳۰ رمضان کو جب سیف الدین قطز اپنی فوج کے ساتھ دمشق میں پہنچے تو وہاں کوئی تاتاری باقی نہ بچا تھا۔ دمشق کے مسلمان مرد عورتوں اور بچوں کا سیلاب آپ کے استقبال کو امڈ آیا تھا۔ اگلے دن قطز نے عید الفطر دمشق میں ادا کی یہ مسلمانوں کے لیے دہری خوشی کا موقع تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو عید کے ساتھ فتح اور آزادی کی مبارکباد دے رہے تھے۔ مساجد میں قطز اور ان کی فوجوں کے لیے خاص طور پر دعاؤں کا اہتمام کیا گیا۔ یہاں سیف الدین قطز نے رکن الدین بیبرس کو ایک لشکر دے کر بھیجا تاکہ وہ بقیہ شامی علاقوں کو تاتاریوں کے ناپاک وجود سے پاک کر سکیں۔ یہ راستے میں بھاگتے ہوئے تاتاریوں کو قتل یا گرفتار کرتے اور مختلف علاقوں میں قید مسلمانوں کو آزاد کرتے ہوئے حمص

اور پھر حلب تک جاپہنچے۔

سیف الدین قطز دمشق میں رک کر ضروری انتظامات کو دیکھتے رہے۔ یہاں تاتاریوں کے دوست، ابن الزکی قاضی تھے۔ ان کو معزول کر کے قاضی نجم الدین ابوبکر بن السنی کو دمشق کا قاضی بنایا گیا۔ امیر اشرف الایوبی اگرچہ تاتاریوں کا دوست تھا لیکن اس نے اپنے قصور کا اعتراف کیا تو سیف الدین قطز نے اسے معاف کر کے حمص کا والی بنا دیا۔ موصل کا والی بدر الدین لؤلؤ تاتاریوں کا مشہور دوست اور مسلمانوں کا غدار تھا جو کچھ عرصہ قبل فوت ہو چکا تھا۔ اس کے بیٹے علاؤ الدین نے قطز کی فرمان برداری اور مسلمانوں سے وفاداری کا عہد کیا تو اسے حلب کا والی بنا دیا گیا۔ مسلمانوں کی ہیبت اور رعب و دبدبہ لوٹ آیا۔ ہلاکو خان ایران کے علاقے تبریز میں مقیم رہا لیکن اس نے دوبارہ شام کی طرف چڑھائی کا ارادہ نہیں کیا۔ البتہ اپنے ایک کمانڈر کو اس نے حلب کی طرف روانہ کیا جس نے کچھ لوٹ مار مچائی لیکن مملوک فوج کے آنے کی اطلاع پا کر مقابلہ کیے بغیر بھاگ نکلا۔

۲۶ شوال کو آپ نے قاہرہ واپسی کا ارادہ کیا تو ۶۴۸ھ والی، الملک الصالح نجم الدین ایوب کی متحدہ ریاست مصر بغیر کسی مسلمان کا خون بہائے قائم ہو چکی تھی۔ یہ انقلاب پندرہ ماہ کی قلیل مدت ذو القعدۃ ۶۵۷ھ سے شوال ۶۵۸ھ تک) میں صرف جہاد فی سبیل اللہ کی برکت سے ظہور پذیر ہوا تھا۔ الملک المظفر سلطان سیف الدین قطز رحمہ اللہ کے بعد ۶۵۹ ہجری میں ملک الظاہر رکن الدین بیبرس رحمہ اللہ حکمران بنے جنھوں نے کچھ عرصے میں فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک کے کئی شہر صلیبیوں سے آزاد کرا لیے اور عظیم مملوک سلطنت وجود میں آگئی جو اگلے اڑھائی سو سال تک عالمِ اسلام کی محافظ بن کر کھڑی رہی۔

اِحیائے خلافت

مملوکوں کا عظیم کارنامہ بغداد میں نابود ہونے والی خلافتِ عباسیہ کو مصر میں زندہ کرنا ہے۔ سلطان بیبرس کو دمشق کے گورنر کی طرف سے اطلاع ملی کہ سقوطِ بغداد کے موقعے پر بچ نکلنے والے آخری خلیفہ، مستعصم باللہ کے چچا اور ان سے پچھلے خلیفہ المستنصر باللہ کے بھائی احمد ابن الظاہر بن الناصر

العباسی ہمارے رابطے میں آ گئے ہیں۔ سلطان نے گورنر کو حکم دیا کہ انھیں عزت و احترام کے ساتھ قاہرہ بھیج دیا جائے۔ جب وہ مصر میں تشریف لائے تو سلطان بیبرس نے پاپیادہ ان کا استقبال کیا اور ایک عظیم الشان محفل کا انعقاد کیا۔ جس میں اعیانِ سلطنت اور فقہاے ملت موجود تھے۔ جب قاضی القضاۃ قاضی تاج الدین نے احمد بن ظاہر کے عباسی اور خاندانِ خلیفہ سے ہونے کی تسلی کر لی تب پہلے انھوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت خلافت کی۔ خلیفہ نے اپنے بھائی کا لقب المستنصر باللہ اپنے لیے اختیار کیا۔ اس کے بعد سلطان بیبرس نے آپ کے ہاتھ پر ''کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کی پابندی، مال مطابق حق وصول کرنے اور مستحق پر خرچ کرنے'' کی بیعت کی۔ اس کے بعد، سلطان العلماء شیخ الاسلام عز بن عبد السلام نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اس کے بعد دوسرے اکابر نے بیعت کی۔ بعد میں پوری سلطنت ممالیک میں خلیفہ احمد المستنصر باللہ دوم کی بیعت کو فروغ دیا گیا اور آپ کے نام کا خطبہ اور آپ کے نام کا سکہ جاری کیا گیا۔ سلطان بیبرس کو خلیفہ کی طرف سے سند و خلعت حکمرانی جاری کی گئی اگرچہ یہ ایک علامتی خلافت تھی لیکن اس کی برکت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ عباسی خلافت کا یہ سلسلہ ۹۲۳ھ تک جاری رہا۔ تا آنکہ آخری عباسی خلیفہ المتوکل علی اللہ سلطان سلیم اول عثمانی کے حق میں خلافت سے دست بردار ہو گئے جہاں سے سلطنتِ عثمانیہ کا سلسلہ شروع ہوا۔

کتابیات

نزهة الأنام في تاريخ الإسلام لابن دُقْماق، التتار من البداية إلى عين جالوت، راغب السرجاني.

السلوك لمعرفة دول الملوك، المقريزي،سيف الدين قطز و معركة عين جالوت للصلابي.

-الأيوبيون والمماليک، دكتور قاسم عبده لبداية والنهاية أبو الفداء بن كثير.

*****

مفتی نذیر احمد ہاشمی مدظلہ

ضبط و ترتیب: مولانا عابد علی

القواعد الفقهية

القاعدة التاسعة: لا ضرر و لا ضرار

نہ ضرر پہنچے اور نہ ضرر پہنچایا جائے

ماخذ

یہ قاعدہ در حقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جسے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے۔ ابنِ ماجہ میں موجود یہ روایت آپ کے جوامع الکلم میں سے ایک جامع کلمہ ہے۔

ضرر کا لغوی معنی

اس لفظ کے کئی معانی ہیں:

۱۔ اشیا میں داخل ہونے والا نقص اور اشیا کی بری حالت کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، اس لیے نابینا آدمی کو ضریر کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کمزور بیمار کو بھی ضریر کہا جاتا ہے۔

۲۔ دوسرا معنی ضیق (تنگی) ہے۔

۳۔ تیسرا معنی قوت و شدت ہے اور اسی سے الضریر (قوتِ نفس) ہے۔ عرب کہتے ہیں: ناقة ذات ضرير ''سخت جان، نہ تھکنے والی اور تیز رفتاری میں اونٹوں کو مات دینے والی اونٹنی''۔

ضرر اور ضِرار کے درمیان فرق

ضرر: مطلقاً کسی دوسرے کو نقصان پہنچانا، اور ضرار: مقابلے میں کسی دوسرے کو ضرر پہنچانا یعنی ہر دو جانبین ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے کے درپے ہوں اس سے قطع نظر کہ ایک کا ضرر دوسرے کے مساوی ہے یا نہیں اور یہ کہ ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں۔

ضرر یہ ہے کہ اپنے فائدے کے لیے دوسرے کو نقصان پہنچانا اور ضرار یہ ہے کہ اپنی منفعت کے بغیر دوسرے کو نقصان پہنچائے یعنی دوسرے کو ایسی چیز سے روک دے جس سے اس کو نقصان پہنچے اور اپنی ذات کو کسی قسم کا فائدہ نہ پہنچے۔

تفریعات

ا۔ عیب کی بنا پر مبیع کی واپسی کا حق شریعت میں موجود ہے، اس کی حکمت اس قاعدے پر دائر ہے کہ نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچاؤ۔

۲۔ ایک جائیداد دو شریکوں کے درمیان مشترک ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کا ارادہ اس کی تعمیر کا ہوا لیکن دوسرے نے اس سے انکار کر دیا، اس صورت میں اس منکر پر فوراً جبر نہ کیا جائے گا بلکہ اگر وہ جائیداد قابلِ تقسیم ہے تو اس کو دونوں شریکوں میں تقسیم کر دیا جائے گا تاکہ ہر شریک اپنے اپنے حصہ سے اپنے طور پر فائدہ حاصل کر سکے اس لیے کہ منکر شریک پر تعمیر کے لیے جبر کرنا اس میں ضرار ممنوع کا شبہہ موجود ہے۔

۳۔ اگر کسی نے اپنی زرعی زمین کسی کو ٹھیکے پر دی اور ٹھیکے کی مدت ایسی صورت میں ختم ہو گئی کہ ابھی کھیتی پوری طرح پکی نہیں، اس صورت میں اس کا کاٹنا نقصان کا سبب ہے تو مالک کو یہ حق نہیں ہو گا کہ وہ مستاجر کو فوراً کھیتی کاٹ لینے پر مجبور کرے بلکہ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ وہ مستاجر کو مہلت دے تاکہ اس کا نقصان نہ ہو۔

* * * * *

فتاویٰ یسئلونک

دارالافتاء، فقہ اکیڈمی

نمازوں اور روزوں کا فدیہ

سوال: ایک خاتون کا گزشتہ روز انتقال ہوگیا، ان کے ذمے دس قضا روزے اور ایک پورے دن کی نماز قضا ہے۔ دس روزوں اور پانچ نمازوں کا فدیہ کتنا ہوگا؟ دونوں کا الگ الگ بتادیں۔

جواب: نمازوں اور روزوں کے فدیے میں وہی مقدار دی جاتی ہے جو صدقۂ فطر میں دی جاتی ہے، یعنی اپنی استطاعت کے مطابق یا تو پونے دو کلو گندم یا اس کی قیمت یا ساڑھے تین کلو جو یا کشمش یا کھجور ایک روزے کے بدلے میں دیا جائے۔ نیز وتر بھی مستقل نماز ہے اس لیے پورے ایک دن کی نماز قضا ہونے کی صورت میں چھے نمازوں کا فدیہ دینا ضروری ہے اور ہر ایک نماز کا فدیہ پونے دو کلو گندم یا اس کی قیمت، یا پھر تین کلو جو یا کشمش یا کھجور ہیں۔ پس کل دس روزے اور چھے نمازوں کا فدیہ حساب لگا کر فقرا کو دے دیں۔ کسی ایک فقیر کو ساری رقم دینا بھی جائز ہے۔

(يعطى لكل صلاة نصف صاع من بر) كالفطرة (وكذا حكم الوتر) والصوم(الدر المختار،كتاب الصلاة،باب قضاء الفوائت).

أو من دقيقه أو سويقه ، أو صاع تمر أو زبيب أو شعير أو قيمته ، وهي أفضل عندنا لإسراعها بسد حاجة الفقير (رد المحتار،كتاب الصلاة،باب قضاء الفوائت).

واللہ اعلم بالصواب

*****

شاعرِ مشرق علامہ اقبال

نظم: غرّہ شوال یا ہلالِ عید

ہلالِ عید پر ایسی نظم نہ اس سے پہلے کبھی لکھی گئی اور نہ بعد میں کسی سے بن آئی (مولانا غلام رسول مہرؔ)

غرّۂ شوال! اے نورِ نگاہ روزہ دار
آ کہ تھے تیرے لیے مسلم سراپا انتظار

تیری پیشانی پہ تحریرِ پیام عید ہے
شام تیری کیا ہے، صبحِ عیش کی تمہید ہے

سرگزشتِ ملتِ بیضا کا تو آئینہ ہے
اے مہِ نو! ہم کو تجھ سے الفتِ دیرینہ ہے

جس عَلَم کے سائے میں تیغ آزما ہوتے تھے ہم
دشمنوں کے خون سے رنگیں قبا ہوتے تھے ہم

تیری قسمت میں ہم آغوشی اسی رایَت کی ہے
حسنِ روز افزوں سے تیرے، آبرو ملت کی ہے

آشنا پرور ہے قوم اپنی، وفا آئیں ترا
ہے محبت خیز یہ پیراہنِ سیمیں ترا

اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے!

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ

دیکھ کر تجھ کو اُفق پر ہم لٹاتے تھے گُہر
اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ

دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بت کدے میں برہمن کی پختہ زُنّاری بھی دیکھ

کافروں کی مُسلم آئینی کا بھی نظارہ کر
اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو
امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ

ہاں، تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے، ان کی خود داری بھی دیکھ

جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا
اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اوروں کی عیاری بھی دیکھ

صورتِ آئینہ سب کچھ دیکھ اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

*****

ماہ نامہ

مفاہیم

فقہ اکیڈمی کا ترجمان

فقہ اکیڈمی: C-335، بلاک-1، گلستانِ جوہر، بالمقابل جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ

fiqhacademy.com.pk info@fiqhacademy.com.pk FiqhAcademy

FiqhAcademy FiqhAcademyPK fiqhacademy +92 330 3474223